اقبال

اور
بزمِ اقبال
حیدرآباد
دکن

عبدالرؤف عروج

اِقبالؔ

اور

بزمِ اقبالؔ

(حیدرآباد دکن)

عبدالرؤف عروجؔ

دارالادب، پاکستان ــــــ کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

طبع اوّل۔ ستمبر ۱۹۷۸ء

تعدادِ اشاعت ۱۱۰۰

ناشر .. .. دارالادب، پاکستان

مقامِ اشاعت .. .. ۸۰۱۔ پی، آئی، بی کالونی۔ کراچی

مقامِ طباعت

سرورق۔ کتابت .. .. خورشید انور

قیمت .. .. اٹھارہ روپے

علامہ اقبال

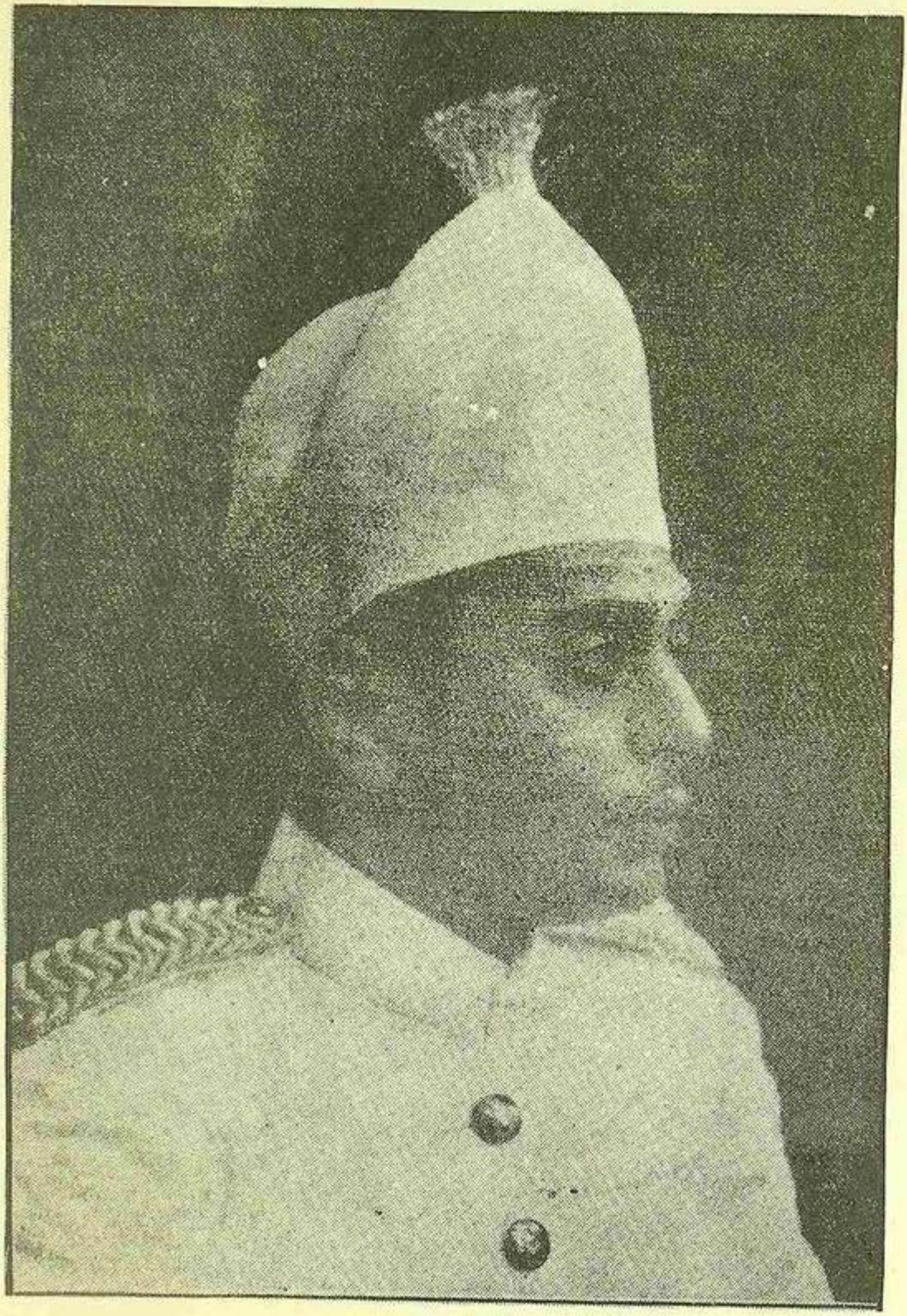

بزمِ اقبال (حیدر آباد دکن) کے بانی نواب حسن یار جنگ

فہرست

دیباچہ	۱۰
عرضِ مصنف	۱۴
پہلا باب	۱۷ - ۴۷
حیدر آباد سے اقبالؔ کا پہلا تعلق	۱۷
امرائے حیدر آباد	۱۹
اقبال کی یورپ سے واپسی	۱۹
عطیہ بیگم کی سفارش	۲۰
نظمؔ سے ملاقات	۲۱
جلیلؔ کی ضیافت	۲۲
حیدری اور مسز حیدری	۲۳
اقبال کی مایوسی	۲۵
یادِ حیدر آباد	۲۶

مزارِ عالمگیر پر	۳۰
مدارس سے واپسی	۳۱
ولاوا وسٹا میں قیام	۳۲
مہاراجہ کی تعرفی تقریر	۳۲
اقبال کے اعزاز میں مشاعرہ	۳۴
نظام سے ملاقات	۳۶
امین جنگ کا استقبالیہ	۳۷
محمد صالح سے ملاقات	۳۸
نظام کا فرمان	۳۹
ڈاکٹر عبداللطیف حیدرآباد میں	۴۲
پہلا جشنِ اقبال	۴۳
حیدرآباد سے اقبال کی بدگمانی	۴۶
اقبال کی وفات	۴۷
جلسۂ تعزیت	۴۷

دوسرا باب

۵۱ - ۶۵

کچھ حسن یار جنگ کے بارے میں	۵۱
بہادر یار جنگ کا ایک یادگاری خط	۵۱
حسن یار جنگ، اسلم جے راجپوری اور اقبال	۵۳
حسن یار جنگ کی اقبال سے ملاقات	۵۴
حسن یار جنگ لندن میں	۵۶

زین یار جنگ اور مزارِ اقبال ۵۷
رفقائے اقبال کی امداد ۶۱
چغتائی کا خط حسن یار جنگ کے نام ۶۵

تیسرا باب ۶۶ - ۷۸

بزمِ اقبال کا قیام ۶۶
حسن یار جنگ اور بزمِ اقبال ۶۸
قائدِ اعظم اور بزمِ اقبال ۶۹
لکھنؤ کا ادارۂ اقبال ۶۹
بزمِ اقبال کا دستور ۷۴
حسن یار جنگ کی زبانی ۷۶
کولاس کا بیان ۷۸

چوتھا باب ۷۹ - ۹۶

اقبال حلقۂ امراء میں ۷۹
بسالت جاہ کی تقریر ۸۰
غلام محمد اور حسن یار جنگ کا خطاب ۸۲
مشاہیر کے پیغامات ۸۴
اقبال کا فلسفۂ خودی ۸۷
اخبارات کا خراجِ تحسین ۸۸
لندن کی مجسمہ ساز خاتون ۹۰

ایک ولولۂ تازہ ۹۱
مہدی یار جنگ کا اظہارِ سپاس ۹۲
بہادر یار جنگ اور اقبال ۹۳
نواب حسن یار جنگ کی تقریر ۹۵
مشاہیر کے پیغامات ۹۶

پانچواں باب ۱۰۲-۱۱۵

مصوروں سے اپیل ۱۰۲
چغتائی کے بھائی کا خط حسن یار جنگ کے نام ۱۰۳
پہلی تصویری نمائش ۱۰۵
حیدرآباد کے مصور ۱۰۶
حسن یار جنگ کی صدارتی تقریر ۱۰۷
صفدر بابی اور اقبال ۱۰۹
رائچور میں تصویری نمائش ۱۱۱
چغتائی اور حسن یار جنگ ۱۱۴
چغتائی کی نمائش ۱۱۵

چھٹا باب ۱۲۶-۱۳۹

اقبال بیرون حیدرآباد ۱۲۶
بہادر یار جنگ کا اشکِ عقیدت ۱۲۸
غوری کا غنائیہ ۱۲۹

یومِ اقبال کی تقریبات ۱۳۰
مشاہیر کے پیغامات ۱۳۴
حسن یار جنگ کا خراجِ عقیدت ۱۳۸
مختلف اہلِ قلم کا اظہارِ سپاس ۱۳۹

ساتواں باب

۱۴۱ - ۱۵۴
عطیہ بیگم اور بزمِ اقبال ۱۴۱
عطیہ بیگم کا اعتراف ۱۴۲
نواب حسن یار جنگ بمبئی میں ۱۴۴
عطیہ بیگم اور نواب حسن یار جنگ ۱۴۸
قائداعظم کا خط حسن یار جنگ کے نام ۱۴۹
اقبال اور قائداعظم ۱۵۱
یومِ اقبال کا اعلان ۱۵۳
مشاہیر کے پیغامات ۱۵۴

آٹھواں باب

۱۵۶ - ۱۵۸
حیدرآباد ظلم کے نرغے میں ۱۵۶
فلسفۂ حیات و موت ۱۵۷
چغتائی کا مقالہ ۱۵۸
یوسف حسین خاں کی صدارت ۱۵۸

دیباچہ

"اقبال اور بزم اقبال" کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے دو مقاصد زیر نظر ہیں۔ ایک تو یہ بتانا مقصود ہے کہ کس دور سے علامہ اقبال کے تعلقات ریاست حیدر آباد دکن سے رہے ہیں۔ نیز ریاست، ریاست کے مسلم عوام اور اعلیٰ حضرت نظام سابع کے بارے میں ان کے ذاتی خیالات کیا تھے۔ دوسری بات یہ کہ علامہ اقبال کن وجوہات کی بناء پر حیدر آباد تشریف لاتے رہے۔

یہاں میں اس بات کا تذکرہ بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبال کے کلام و پیام اور فلسفہ سے مجھے ذاتی لگاؤ کس طرح پیدا ہوا اور اس میں کس طرح شدت پیدا ہوتی رہی جس کا اظہار مرکزی بزم اقبال کے صدر کا عہدہ سنبھالنے اور حتی الامکان علامہ کے کلام و پیام کے نشر و اشاعت کی کوشش جاری رکھنے کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں مدرسہ عالیہ نظام کالج حیدر آباد دکن کے اردو کے استاد جناب آفتاب علی صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے اُردو کے دیگر ممتاز شعرا کے کلام کے ساتھ ساتھ اپنے تمام شاگردوں کو کلامِ اقبال کے نکات بھی سمجھائے اور ہم کو "شکوہ" اور "جواب شکوہ" زبانی یاد کرایا۔ اس کے بعد ہی سے کلامِ اقبال کے حُسن اور اس کی اہمیت نے میرے دل میں جگہ کر لی، ساتھ ہی ساتھ جذبۂ اسلامی بھی بیدار ہونا شروع ہوا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں جب میں بغرضِ تعلیم ایم۔ اے۔ او کالج علیگڑھ گیا (اس وقت کالج کو یونیورسٹی کا درجہ نہیں ملا تھا) تو خوش قسمتی سے کالج میں تاریخ اسلام کے ممتاز پروفیسر

مولانا اسلم جے راجپوری میرے خانگی استاد مقرر ہوئے۔ وہ خود کلام اقبال سے شیدائی تھے چنانچہ انہوں نے بھی علامہ کے کلام کے اہم نکات مجھے سمجھائے۔ مولانا کی تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور ۱۹۱۹ء میں مولانا اسلم جے راجپوری کے ساتھ ہی لاہور جاکر میں نے علامہ اقبال سے پہلی ملاقات کی جس کا اثر ابھی تک میرے دل پر نقش ہے لیکن افسوس کہ میری یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی کہ علامہ کے کلام کو ان کی زبان سے سنتوں اور فلسفۂ اسلامی کے بارے میں سوالات کرکے ان کے جواب معلوم کروں۔

۱۹۳۰ء میں میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان چلا گیا لیکن علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ وہاں بھی مجھ سے نہیں چھوٹا۔ ۱۹۳۹ء میں جب میں اپنی تعلیم مکمل کرکے حیدر آباد واپس پہنچا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میرے دوست اور ہم خیال رفیق نواب بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے عوامی جلسے کرنے اور عوام میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔

یہاں نواب بہادر یار جنگ سے میرے ذاتی تعلقات کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ مدرسہ عالیہ نظامیہ کالج میں ابتدائی تعلیم کے زمانہ ہی سے نواب بہادر یار جنگ سے میری ملاقات تھی۔ نواب صاحب مختصر عرصہ تک فرسٹ فارم میں میرے ہم جماعت بھی رہے تھے۔ ہم دونوں کے خیالات میں یکسانیت کے سبب ہماری ملاقات نے مخلصانہ دوستی کی صورت اختیار کر لی جو نواب صاحب کے انتقال تک نہ صرف جاری رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ میرے پاس مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایسے متعدد خطوط موجود ہیں جن سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد بھی نواب بہادر یار جنگ سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور اسلامی اور سیاسی مقاصد کے لئے مشوروں میں میں ان کا ساتھی رہا۔ ان کی اعلیٰ خطابت اور ذہانت کی وجہ سے عوام میں ان کی مقبولیت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ علامہ اقبال کے کلام اور فلسفہ سے مجھے جو لگاؤ رہا تھا، نواب صاحب اس سے خوب واقف تھے۔ ہمارا مقصدِ حیات

یہ تھا کہ مسلم عوام میں اسلامی جذبہ نہ صرف پیدا ہو بلکہ اس میں روز افزوں ترقی ہوتی رہے حتیٰ کہ مسلمان اپنے صحیح مقام سے واقف ہو جائیں اور اغیار نے ریاست پر جو مخالفانہ حملوں کا سلسلہ شروع کیا تھا اس کا صحیح طریقے سے مقابلہ کر کے اس کا خاتمہ کیا جا سکے۔ نواب بہادر یار جنگ کی خواہش تھی کہ میں بھی ان کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھوں مگر بدقسمتی سے اعلیحضرت نظام دکن نے خانوادۂ شاہی سے تعلق رکھنے والے افراد کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کر رکھا تھا لیکن علامہ اقبال کے کلام و پیام سے میرے لگاؤ نے میرے لئے ایک نئی راہ ہموار کر دی اور میں نے نواب بہادر یار جنگ کے مشورے سے بزمِ اقبال کے ادارہ میں عملی قدم جما دیا کیونکہ ہمارا جو مقصدِ حیات تھا وہ اس علمی ادارے کے ذریعے ہی پوری طرح تکمیل پا سکتا تھا۔

۱۹۳۹ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو بدقسمتی سے علامہ سے دوبارہ ملنے کی حسرت پوری نہ ہو سکی کیونکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ حیدرآباد اور اضلاع میں متعدد تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ میں ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبال کا باقاعدہ طور سے صدر منتخب ہو گیا۔ میں نے بزمِ اقبال کا ایک باضابطہ دفتر قائم کر کے علامہ کے کلام کی نشر و اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ میں نے بزم کا ایک دستور بھی ترتیب دیا۔

۱۹۴۱ء میں جب قائداعظم حیدرآباد تشریف لائے تو نواب بہادر یار جنگ نے انہیں اپنے بنگلہ پر مدعو کیا اور مجھے بھی اس ملاقات میں بلوایا۔ یہ قائداعظم سے میری پہلی ملاقات تھی۔ نواب بہادر یار جنگ نے بزمِ اقبال کے صدر کی حیثیت سے قائداعظم سے میرا تعارف کرایا۔ قائداعظم نے اس اہم کام کو پسند فرماتے ہوئے آئندہ کبھی بزمِ اقبال کے دفتر میں تشریف لانے کا وعدہ فرمایا جو بعد میں انہوں نے پورا بھی کیا۔

مرکزی بزمِ اقبال کے ذریعے میں نے اور میرے رفقاء نے جو کام کئے اس دیباچہ میں اس کی تفصیل ممکن نہیں۔ مختصر یہ کہ علامہ اقبال کے کلام و پیام و فلسفہ کی نشر و اشاعت کے لئے

ہم نے جو کوششیں کیں اس وقت تک ہندوستان کے کسی بھی حصہ یا شہر میں نہیں ہو پائی تھیں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے ریاست حیدرآباد دکن سے تعلقات اور پھر بزم اقبال کے کارنامے کے فراموش ہونے کا احتمال پیدا ہو گیا تھا اس لئے مجھے خیال پیدا ہوا کہ ان اہم تاریخی واقعات کو ایک کتابی شکل دے دی جائے تاکہ تاریخی ریکارڈ محفوظ ہو جائے چنانچہ اس کام کی تکمیل کے لئے میری نظر اپنے دوست جناب عبدالرؤف عروج پر پڑی جن کی علمی قابلیت اور تحقیقی صلاحیت کا مجھے علم تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ عروج صاحب نے اس اہم کام کو مکمل کرنے کی حامی بھر لی۔ میرے پاس بزم اقبال کے کاموں اور کارکردگی کا جو ریکارڈ محفوظ تھا، میں نے وہ سب عروج صاحب کے سامنے رکھ دیا جس میں اخباری رپورٹیں، صدارتی خطبات، اہم شخصیتوں کے پیغامات، رسائل اور خطوط کے علاوہ بزم سے متعلق تصاویر بھی شامل تھیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جناب عبدالرؤف عروج نے اس کتاب کو نہایت غور و فکر اور قابلیت و محنت کے ساتھ مکمل کیا جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اس سلسلہ میں میرے قدیم دوست اور بزم اقبال کے کارکن جناب حسام الدین غوری بھی اپنے مشوروں سے ہماری مدد فرماتے رہے اور میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ ہماری کوشش تھی کہ ۱۹۷۷ء ہی میں جو علامہ اقبال کا سال تھا، یہ تصنیف مکمل ہو جائے مگر بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہماری یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اب جبکہ بفضل خدا یہ کتاب تیار ہو کر عوام کے سامنے آ گئی ہے مجھے امید ہے کہ علامہ اقبال کے کلام اور ان کے فلسفۂ اسلامی سے لگاؤ رکھنے والے حضرات اور خواتین اور خصوصاً ملک کا نوجوان طبقہ اس کتاب کا بغور مطالعہ کرے گا اور مستفید ہو گا۔

حسن یار جنگ

عرضِ مصنّف

دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد حیدرآباد نے ہر دور اور ہر زمانے میں ملک کے باکمالوں کی قدر کی، اس کے مردم شناس امیروں اور علم دوست رئیسوں نے اہل علم و فن کو سر آنکھوں پر بٹھایا جس کے نتیجے میں ایک دو نہیں، سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی شہرت کا آفتاب حیدرآباد ہی کے افق سے طلوع ہوا اور پھر اس کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلی، ایسے صاحبانِ علم و فن اور ارباب شعر و سخن میں داغؔ اور امیرؔ کے بعد بلاشبہ اقبالؔ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد سے اقبالؔ کا پہلا تعلق طالب علمی کے زمانے میں پیدا ہوا تھا پھر وہ زندگی کے آخری لمحے تک ذہنی طور پر حیدرآباد کے مسلمانوں سے متاثر رہے تھے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو ایسا ہے جس پر کسی نے تفصیل سے نہیں لکھا ہے اور لکھا بھی تو اس طرح جیسے

یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ جس کے نتیجہ میں اقبالؔ اور حیدرآباد کے تعلقات کے سلسلہ میں سینکڑوں غلط فہمیاں راہ پاگئیں اور یہ خیال روز بروز مستحکم ہوتا چلا گیا کہ حیدرآباد نے اقبالؔ کی قدرشناسی اور سرپرستی میں بخل سے کام لیا اور اس وقت بھی ان کو کسی قسم کی اخلاقی اور مادی مدد بہم نہیں پہنچائی جب کہ وہ مرض الموت کے قریب آپہونچے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد ہی میں اقبالؔ کے اُردو کلام کا پہلا مجموعہ کلیاتِ اقبالؔ کے نام سے شائع ہوا ۔ حیدرآباد ہی میں اقبالؔ کی زندگی میں پہلی مرتبہ ان کا جشن منایا گیا حیدرآباد میں ہی ان کی وفات پر پہلا سب سے بڑا تعزیتی جلسہ ہوا۔ حیدرآباد ہی میں سب سے پہلے مرکزی بزمِ اقبالؔ قائم کی گئی۔ حیدرآباد ہی میں وہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے ادب میں اقبالیات کا اضافہ کیا۔ حیدرآباد ہی نے یومِ اقبالؔ اور ہفتۂ اقبالؔ کی روایت عام کی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی تاریخ کے آخری دور میں بھی اقبال کی یاد کو سینہ سے لگائے رکھا۔

اقبالؔ حیدرآباد شناس تھے اور حیدرآباد اقبالؔ شناس ، میں نے زیرِ نظر کتاب میں اسی بات کو ثابت کرنے کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے حیدرآباد کے تمام روزناموں، ماہنامو اور ہفتہ وار جریدوں میں شائع ہونے والی ان رپورٹوں اور رودادوں سے فائدہ اٹھایا جو ۱۹۳۸ء سے لیکر ۱۹۴۸ء تک شائع ہوتی رہیں۔ ان رپورٹوں اور رودادوں کا سارا ریکارڈ، اقبال کے سچے قدرداں اور حیدرآباد کے سب سے زیادہ

نامور امیر نواب حسن یار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور جس کو انہوں نے بڑی احتیاط اور محنت سے فراہم کیا ہے۔ میں ان کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف مجھے اس ریکارڈ کے دیکھنے کا موقع فراہم کیا بلکہ میری توجہ اس امر کی جانب بھی مبذول کرائی کہ میں اقبال اور حیدرآباد اور وہاں کی مرکزی بزم اقبال کی کارکردگی کی روشنی میں ایسی کوئی کتاب لکھوں جس کے ذریعے حیدرآباد کے متعلق اقبال شناسی کا ایک محو شدہ باب سامنے آسکے۔

مجھے امید ہے کہ ملک کے اقبال شناس زیر نظر کتاب کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ انہوں نے اقبالیات کے سلسلے میں کتنے اہم کام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کو نواب حسن یار جنگ کا مرہونِ منت ہونا چاہیئے۔ اگر وہ اس سلسلہ میں مجھ سے تعاون نہ کرتے تو نہ یہ کتاب منظر عام پر آتی نہ مجھے اس موضوع پر غور کرنے کا موقع ملتا۔

عبدالرؤف عروج

پہلا باب

حیدر آباد سے اقبال کا پہلا تعلق

حیدر آباد سے اقبال کے تعلق کی کہانی بہت پُرانی ہے۔ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے، نظام دکن کا استاد ہونے کی وجہ سے نواب مرزا داغ کی شہرت آسمان پر تھی۔ لوگ جوق در جوق اِن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے لگے تھے۔ غزلیں ڈاک کے ذریعہ ان کے پاس اصلاح کے لئے آتی تھیں اور اصلاح کے بعد واپس بھیج دی جاتی تھیں اس کے لئے ان کو ایک عملہ اور ایک محکمہ بھی رکھنا پڑا تھا۔ اقبال نے بھی اِن کو حیدر آباد ہی کے پتہ پر خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کا نام تلامذہ کے رجسٹر میں درج ہوا۔ اسی کے کچھ دنوں بعد مولانا احسن مارہروی حیدر آباد پہونچ کر داغ کی خدمت میں شب و روز حاضر رہنے لگے۔ داغ نے اِن کی صلاحیتوں کی قدر کرتے ہوئے تلامذہ سے متعلق محکمہ اور عملہ کا ان کو نگراں مقرر کیا جس کے نتیجہ میں بیرونِ حیدر آباد سے اصلاح کے لئے آنے والی تمام غزلیں ان ہی کے توسط سے داغ کی نظر سے گزرنے لگیں۔ اسی زمانے میں اقبال نے ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کو گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل سے مولانا احسن مارہروی کو لکھا،

"اگر آپ کے پاس استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمائیے گا کہ کہاں سے مل سکتی

ہے۔ کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس حضرت کا فوٹو ضرور موجود ہوگا۔
اگر آپ کو معلوم ہو تو ازراہِ عنایت جلد مطلع فرمائیے گا۔[۱]

۱۴ فروری ۱۹۰۵ء نواب مرزا داغ نے فالج کے عارضہ میں مبتلا ہونے کے بعد وفات پائی۔ ان کی وفات کا سوگ نہ صرف حیدرآباد بلکہ دہلی، رام پور اور پنجاب میں بھی منایا گیا۔ اقبال نے بڑی دردناک نظم لکھی جس کا ایک مصرعہ یہ ہے۔

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اِسی کے چند دن بعد اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یورپ روانہ ہوگئے اِس وقت تک اقبال نے حیدرآباد دیکھا نہ تھا۔ اس کے باوجود وہاں کی معارف پروری، علم دوستی اور اہلِ سخن کی قدر افزائی کے چرچے ان کے کانوں تک پہنچ چکے تھے اور ان کو یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کی تباہی اور بربادی کے بعد حیدرآباد ہی ایک ایسی ریاست ہے جہاں ملک کے تمام اہلِ کمال کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع مِل سکتا ہے۔ چنانچہ یورپ کے زمانۂ قیام میں بھی وہ حیدرآباد کو نہیں بھولے اور ان کی غزلیں وہاں کے مختلف رسالوں اور جریدوں میں چھپنے لگیں۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۰۵ء کے دکن ریویو میں شائع ہونے والی ان کے ایک غزل کا مقطع ہے

ترے سخن کی نہ ہو قدر کیوں گراں اقبال
پسند اس کو وزیر نظام کرتے ہیں[۲]

---

۱ مکاتیبِ اقبال، جلد اوّل

۲ سرود رفتہ۔ غلام رسول مہر

امرائے حیدرآباد

یہ زمانہ آخری تاجدار آصفی کے والد نواب میر محبوب علیخاں کے دورِ حکومت سے عبارت تھا۔ اس زمانے میں مہاراجہ کشن پرشاد کے علاوہ امرائے پائے گاہ بھی علم وادب کی سرپرستی میں پیش پیش تھے۔ سر خورشید جاہ، سر آسمان جاہ اور وقار الامرا کا ذکر اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ علامہ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور متعدد دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے ان کے خوانِ نعمت پر زلہ ربائی کی اور ان کی مدح میں انتہائی شاندار قصیدے لکھے جن کو ادب کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان امرا اور رؤسا کی قدردانی اور سرپرستی، بڑے بڑے حکمرانوں کی سخاوتوں کو آئینہ دکھا رہی تھی۔ ان واقعات کے ساتھ اقبال کو قیامِ یورپ کے زمانہ میں ایسے متعدد افراد سے ملنے کا موقع ملا جو حیدرآباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں مسز سروجنی داس جو بعد میں سروجنی نائیڈو بنیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اقبال کی یورپ سے واپسی

یورپ سے واپس آنے کے بعد اقبال کو کئی ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جذباتی طور پر انہوں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی پروفیسری کی پیش کش بھی ٹھکرادی انہوں نے ۹ راپریل ۱۹۰۹ء کو عطیہ بیگم کے نام ایک خط میں لکھا

"میں کسی قسم کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں۔ آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے۔ میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرض دار ہوں اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔ میری زندگی سخت مصیبت بنی ہوئی ہے۔ وہ مجھ پر کوئی سی

بھی بیوی زبردستی منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ اِن کو میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں ہے بالخصوص جبکہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں اس کی کفالت کرنے پر بالکل رضامند ہوں لیکن میں اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرّت اور خوشی حاصل کرنے کا حق ہے۔ اگر سوسائٹی مجھے وہ حق دینے سے انکار کر دے تو میں دونوں کا کھلم کھلا مقابلہ کروں گا۔ واحد علاج یہ ہے کہ میں اِس بدبخت ملک کو چھوڑ کر چلا جاؤں یا، شراب نوشی میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔

یہ زمانہ اقبال کے لئے سخت ذہنی پریشانی کا زمانہ تھا۔ وہ جلد سے جلد لاہور سے نکل جانا چاہتے تھے۔ چونکہ ان کے ذہن میں حیدر آباد کا تصوّر ایک ایسی جنّت سے کم نہیں تھا جہاں دولت تھی، علم تھا، بے فکری تھی اور زندگی کی راحت و آسائش کے تمام سامان، چنانچہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ حیدر آباد جائینگے۔

عطیہ بیگم کی سفارش

اس وقت حیدر آباد شمالی ہند کے تمام ادبا اور شعرا کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ نواب میر محبوب علیخاں کی علمی سرپرستیوں نے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ ایک مورخ کے بیان کے مطابق آسمان سونا برسا رہا تھا اور زمین چھپے ہوئے خزانے اُگل رہی تھی۔ اس کے باوجود اس وقت اقبال کا ادبی قامت ایسا نہیں تھا کہ لوگ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے۔ ان کی خاطر خواہ پذیرائی کی جاتی۔ غالباً اقبال کو بھی اس امر کا احساس تھا کہ جہاں ملک کی نامی گرامی صاحبان فن کافی بہت بڑی تعداد میں

موجود ہیں۔ ان کا کسی تعارف اور شناسائی کے بغیر وہاں پہنچنا بے سود رہے گا۔ چنانچہ اُنہوں نے عطیہ بیگم کو خط لکھا کہ وہ حیدرآباد جانا چاہتے ہیں، ان کا مسٹر حیدری اور مسز حیدری سے تعارف کرایا جائے۔ عطیہ بیگم کو اندیشہ تھا کہ اقبال حیدرآباد جاکر اپنی توجہات کو معمولی کاموں کے لئے وقف کردیں گے بجائے اس کے کہ وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ وہ جانتی تھیں کہ اقبال مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اور ان کے بقول جس آدمی کی راہ میں اس قسم کی مشکلات حائل ہوں وہ ہر اس تنکے کا سہارا لیتا ہے جو اس کی راہ میں آجائے چنانچہ انہوں نے انہیں ایک خط بھیج دیا جس میں ان کا اپنے پھوپھی زاد بہن اور بھائی مسز حیدری اور مسٹر حیدری سے تعارف کرایا گیا تھا[1]۔ حیدری صاحب اس وقت معتمد فنانس تھے اور ان کو اربابِ حکومت میں بڑا اثر و نفوذ حاصل تھا۔

اقبال ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد پہنچے۔ ان کے پاس حیدری اور مسز حیدری کے نام عطیہ بیگم کا تعارفی خط تھا۔ اس لئے ان کو کسی قسم کی زحمت نہیں اُٹھانا پڑی۔ حیدری صاحب ادیب اور شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی علم و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ شعر فہمی کا بھی ان کو خاص ملکہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف اقبال کی خاطر خواہ پذیرائی کی بلکہ مہمان بھی رکھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اقبال سے متاثر تھے بلکہ ان کو عطیہ بیگم نے کہا تھا۔

نظم سے ملاقات

ایک دن سر اکبر حیدری مقامی ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں تبادلۂ خیال

---

[1] نقش اقبال۔ از عبدالواحد

کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں نظم طباطبائی کا بھی تذکرہ نکل گیا۔ اقبال نے اِن کی نظم گورِ غریباں طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھی، ملاقات کے لئے بے چین ہو گئے اور خواہش ظاہر کی کہ ان سے ملاقات کا انتظام کرا دیا جائے۔ نظم اس وقت نظام کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے مامور تھے۔ سر اکبر حیدری نے اپنے نائب صدر محاسب عبدالرزاق راشد کو نظم کی خدمت میں روانہ کیا اور درخواست کی کہ وہ ان کے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ جب نظم سر اکبر حیدری کے دولت کدے پہنچے تو عبدالرزاق راشد نے ان سے اقبال کا تعارف کرایا۔ کچھ دیر رسمی باتیں ہوئیں پھر اقبال نے اِن سے اپنا کلام سنانے کی درخواست کی۔ نظم نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب کے اشعار سنائے ؎

ناقۂ گردوں کی کھینچی لیلیٰ شب نے مہار

نظم کے اشعار سُن کر اقبال نے بے انتہا داد دی اور ان پر ان کی شاعرانہ عظمت اور قادر الکلامی کا اس درجہ اثر ہوا کہ ان کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو گیا اور پھر انہوں نے نظم کے رُخصت ہونیکے بعد ان ہی کی زمین میں فکر کی اور "طلوعِ سحر" کے نام سے وہ مشہور قصیدہ لکھا جو بانگ درا میں طلوعِ صبح کے نام سے شامل ہے۔[1]

جلیل کی ضیافت

اقبال حیدر آباد کے تمام اہل کمال سے ملنا چاہتے تھے۔ جلیل مانک پوری (فصاحت جنگ) جو داغ کے بعد استاد شاہ ہوئے تھے، نے اس کی صورت یہ پیدا کی کہ شہر کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا اور موقع پر ظہیر دہلوی بھی اپنی نقاہت اور بڑھاپے کے باوجود تشریف لائے۔ اقبال کے نزدیک ان کی ہستی بڑی متبرک

---

[1] نقشِ اقبال۔ از عبدالواحد معینی

تھی۔ اقبال کا اس سلسلہ میں بیان ہے کہ:

"میں حیدر آباد دکن گیا تو یہ ضروری بات تھی کہ وہاں کے اہلِ کمال سے ملوں۔ چنانچہ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری کے ہاں میری دعوت ہوئی۔ وہیں مولانا ظہیر دہلوی بھی تشریف لائے۔ مولانا نے مجھ سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی مگر سنانے سے زیادہ مجھے خود یہ شوق تھا کہ مولانا کی زبان سے کوئی شعر سنوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جب تک میں پہلے آپ کی زبان سے شعر نہ سُن لوں گا اپنا شعر ہرگز نہ سناؤں گا۔ مولانا نے اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے فرمایا۔

وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو
وہ کچی آگ ہے جسمیں دھواں ہو

ایک آدھ شعر اور بھی سُنایا مگر یاد نہیں رہا۔ مولانا ظہیر اس وقت بہت ضعیف اور ناتواں تھے اور اونچا بھی سنائی دیتا تھا۔" ص۱

حیدری اور مسز حیدری

سر اکبر حیدری معتمد فنانس تھے۔ ان کی وجہ سے اقبال کو حیدر آباد کے علمی اور ادبی حلقوں میں بہت جلد اہمیت حاصل ہو گئی اور ہر جگہ ان کا ذکر کیا جانے لگا جس کے نتیجہ میں اقبال کو یہ خوش فہمی ہو گئی کہ نظام ان سے ملنے کی خواہش کا

ص۱ صحیفہ اقبال نمبر۔ نوادر۔ عبداللہ قریشی
" معاصرین اقبال کی نظر میں۔ عبداللہ قریشی

اظہار فرمائیں گے۔ غالباً ان کو اس کا علم نہیں تھا کہ خود داغ نے کتنے برسوں کی کوششوں اور ناکامیوں کے بعد نظام تک رسائی حاصل کی تھی اور استاد مقرر ہوئے تھے۔ اگر ان کے علم میں یہ بات ہوتی تو وہ یقیناً عطیہ بیگم کو یہ کبھی نہ لکھتے۔

اگر میں حیدر آباد میں کچھ دن اور ٹھہرتا تو مجھے یقین ہے کہ ہز ہائی نس نظام مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار فرماتے۔[1]

سر اکبر حیدری اور مسز حیدری نے جس طرح اقبال کی مہمان داری کی اور ان کی تمام تر دلچسپیوں کو ملحوظ رکھا، اس کا اندازہ اقبال کے اس خط کے مندرجات سے بھی ہو جاتا ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں عطیہ بیگم کو لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میں حیدر آباد کے سب بڑے آدمیوں سے ملا۔ میرا حیدر آباد جانا کچھ معنی رکھتا تھا ..... مسٹر اور مسز حیدری سے ملنا میری سیاحت کا واحد مقصد نہ تھا۔ شاید آپ جانتی ہیں کہ حیدر آباد میں ان سے ملاقات کرنے سے قبل مجھے ان سے وقفیت کی مسرت بھی حاصل نہیں تھی میں ان کے یہاں کے قیام سے بہت لطف اندوز ہوا۔ یہ مسز حیدری کی انتہائی مہربانی ہے کہ یہ میرا ذکر اس محبت سے کرتی ہیں۔ مجھے ان کے یہاں گھر کا سا آرام ملا۔ ان کی عربی اسپرٹ کو بے حد پسند کرتا ہوں اور ان تمام کاموں میں جو ان کی توجہ یا سمدردی حاصل کر لیتے ہیں، میں ان کی سمجھ داری اور دانشمندی کا مداح ہوں۔ زیادہ تر مسٹر اور مسز حیدری کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ مجھے حیدر آباد کی سوسائٹی کے بعض بہترین نمونے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مسٹر حیدری

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم

اعلیٰ کلچر اور وسیع ہمدردیاں رکھنے والے شخص ہیں۔ میں انہیں خشک حقائق اور مالی اعداد و شمار کا آدمی سمجھ بیٹھا تھا لیکن قدرت نے انہیں ایک نہایت نفیس تخیّل اور بہت ہی نازک دل عطا کیا ہے۔ میرے دل میں اِن دونوں کا بے حد احترام ہے۔ ان کا گھر دوسری حقیقی جگہ ہے جہاں مجھے گھر کا سا آرام ملا۔ پہلی جگہ آرنلڈ کا گھر تھا مسز حیدری اپنے میں وجدانی کیفیت رکھتی ہیں جس کی وجہ سے یہ اس سے زیادہ طریقہ سے چیزیں دیکھ سکتی ہیں جتنا مرد اپنے ٹھنڈے تجزیہ کرنے والے استدلال کے ذریعے دیکھنے کے عادی ہیں"[1]

اقبال کی مایوسی

اقبال کو حیدر آباد سے بڑی امیدیں تھیں، وہ کسی اچھے عہدے کے بھی خواہاں تھے۔ اس کے علاوہ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ خود نظام ان کو اس سلسلہ میں کوئی پیشکش کریں۔ حیدر آباد کوئی بہت ہی مختصر اور معمولی ریاست نہیں تھی۔ سکہ، ڈاک، ریل وغیرہ سب اس کے اپنے تھے پھر اس کی آبادی اور رقبہ بھی دُنیا کے کئی ممالک سے زیادہ تھا۔ اس صورت میں اقبال کی یہ خواہش پوری ہو سکتی تھی نہ پوری ہوئی ـــــ چنانچہ انہوں نے اس جذبہ اور خواہش کو بے معنی قرار دینے کی کوشش میں عطیہ بیگم کو لکھا۔

"مَیں نے یہ کب کہا تھا کہ نظام کی قدر شناسی میری عزّت افزائی کا سبب ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میں اِن تمام باتوں کی مطلق پروا نہیں

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم

کیا کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ بحیثیت شاعر کے پہچانا جاؤں اگرچہ بدقسمتی سے لوگ مجھے اسی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ ایک اطالوی پیرِ دلنس کا خط نیپلز سے میرے پاس آیا تھا جس میں مجھ سے میری چند نظمیں معہ انگریزی ترجمہ طلب کی گئی تھیں لیکن شاعری کے متعلق میں اپنے دل میں کسی قسم کا جذبہ محسوس نہیں کرتا ہوں۔ میں ایک ہندوستانی والی سلطنت کی قدر شناسی کی کیا پروا کر سکتا ہوں جبکہ غیر ممالک کے صاحب کلچر اشخاص کی قدر شناسیاں مجھے ملتی رہتی ہیں۔" ؎۱

یادِ حیدر آباد

اقبال نے حیدر آباد کے قیام کے دوران ایک اور نظم "گورستان شاہی" کے عنوان سے گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہوں کے مقبروں سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ یہ نظم ان کے حیدر آباد سے لاہور جانے کے بعد 'مخزن' میں شائع ہوئی تھی اس نظم کے ساتھ اقبال نے یہ نوٹ لکھا تھا

"حیدر آباد دکن سے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما مسٹر نذر علی بی اے معتمد محکمۂ فنانس کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربے سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے۔ مجھے ایک شب اِن شاندار مگر حسرت ناک قبروں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہی سو رہے تھے۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھَن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر

؎۱ اقبال، از عطیہ بیگم

کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہیں ہوگا
ذیل کی نظم ان ہی بیشمار تاثرات کا ایک اظہار ہے اس کو میں اپنے
سفرِ حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لیق بیگم مسز حیدری
کے نام سے منسوب کرتا ہوں جنہوں نے میری مہمان نوازی اور میرے
قیام حیدرآباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہیں کیا۔[1]

سر اکبر حیدری نے اقبال کو جن ادیبوں اور شاعروں سے ملایا تھا وہ مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں باقاعدگی کے ساتھ جاتے تھے۔ جب ان کی قدردانی اور فیاضی کا تذکرہ اقبال نے خاص وعام کی زبان سے سُنا تو ملاقات کے مشتاق ہوگئے مہاراجہ کے نزدیک امیر وغریب، شاعر وادیب، عالم وصوفی کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ان کا سلوک سب ہی سے یکساں تھا۔ انہوں نے اقبال کی بڑی دلجوئی اور مہمان نوازی کی۔ اور اپنے موروثی عجز وانکسار نے ان کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اس ریاست کے صدر المہام سے مل رہے ہیں۔

مہاراجہ کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مدحیہ قصیدہ میں شکریہ کے عنوان سے لکھا ہے

مجھے آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالیجناب ہز ایکسلینسی مہاراجہ
سر کشن پرشاد و بہادر جی سی آئی ای یمین السلطنت پیش کار وزیر اعظم

---

[1] ماہنامہ مخزن۔ ۱۹۱۲ء
ایضاً سرودِ رفتہ۔ غلام رسول مہر
" اقبال۔ محی الدین قادری

دولت آصفیہ المتخلص شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا بھی فخر حاصل ہوا۔ ہز ایکسیلنسی کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا وہ میرے لوحِ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ ممدوح نے میری روانگی حیدر آباد سے پہلے ایک نہایت لطف آمیز خط لکھا

اقبال کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے وزیراعظم کی جانب سے ان کی اس قدر دلجوئی اور پاس داری ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ مہاراجہ کے طرزِ سلوک سے متاثر ہی نہیں رہے بلکہ گرویدہ بھی ہو گئے اور انہوں نے نظم طباطبائی کے مشہور نعتیہ قصیدے کی زمین اور ردیف میں شکریہ کے عنوان سے مہاراجہ کا قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

آستانے پر وزارت کے ہوا اِک دن گذر
بڑھ گیا جس سے مرا ملک سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسماں اس آستانے کی ہے اِک موجِ غبار
کی وزیر شاہ نے وہ عزّت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے ہیں نثار
مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

ص۱ مخزن، جون ۱۹۱۰ء

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

لیلیٰ معنی کا محمل اس کی نثرِ دل پذیر
نظم اس کی شاہدِ حسنِ ازل کی پردہ دار

اس کا فیضِ پاک منّت خواہ کانِ لعل خیز
بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اس کی مروّت کا یونہی تا انتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دِل رُبا اس کا تکلّم خلق اس کا عطرِ گُل
غنچۂ دل کے لئے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبّر کو کہاں
جس پہ ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی
دست وقف کارفرمائی و دل مصروفِ کار

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو سرورِ روزگار

شکریہ احسان کا اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار[1]

---

[1] مخزن، جون ۱۹۱۰ء

مزارِ عالمگیر پر

اقبال کے نزدیک عالمگیر اسلامی قومیت کا اصل بانی تھا۔ وہ اس کے بارے میں بہت اچھے جذبات اور خیالات رکھتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ جاتے ہوئے اس کے مزار پر ضرور حاضری دیں چنانچہ جب وہ ۲۳ مارچ کو لاہور روانہ ہونے لگے تو سر اکبر حیدری نے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ ایک دو روز، اورنگ آباد میں بھی گذار سکیں اور وہاں سے بمبئی کے راستے لاہور پہنچ جائیں انہوں نے اورنگ آباد پہونچنے سے پہلے ایک خط میں عطیہ بیگم کو لکھا:

"واپسی پر اورنگزیب کے مقبرے کی زیارت بھی کرنی ہے جس پر میں ایک نہایت ولولہ انگیز نظم لکھنے والا ہوں جو اردو پڑھنے والوں کے لئے نہایت درجہ روح پرور ہوگی ۔"[1]

اورنگ آباد ایک تاریخی شہر کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں مشہور تھا۔ اجنتا کی نقاشی اور ایلورا کی پیکر تراشی کی پوری دنیا میں دھوم تھی۔ اس کے علاوہ اس کی خاک میں سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی کے خلفاء میں برہان الدین غریب، منتجب الدین دہلوی اور دوسرے افراد آسودہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ سلطنت آصفیہ کے بانی نظام الملک آصف جاہ اور ان کے جانشینوں کی قبریں بھی وہیں تھیں۔ اور تو سب "اعتبار دودمان گورگاں یعنی، شاہ عالمگیر گردوں آستاں" آرام فرما تھا۔ یہ سب چیزیں اقبال کے لئے بڑی پرکشش تھیں چنانچہ انہوں نے لاہور جاتے ہوئے دو دن کیلئے اورنگ آباد میں بھی قیام کیا۔

اورنگ آباد میں میزبانی کے فرائض کس نے انجام دیئے؛ اس کی تفصیل ہمارے سامنے نہیں ہے[2]۔ اس وقت ضیار یار جنگ جیسے فارسی کے مشہور شاعر، بشیر الدین

---

[1] اقبال، عطیہ بیگم [2] نقشِ اقبال۔ واحد معین

صدیقی افسر اورنگ آبادی جیسے صاحبِ تحریر بزرگ اورنگ آباد ہی میں موجود تھے قیاس غلط نہیں ہے تو پھر اقبال کی سیر و سیاحت کا انتظام ان ہی بزرگوں میں سے کسی ایک نے کیا ہوگا۔

اقبال نے مزار عالمگیر پر حاضری دی اور اپنی ایک بیاض میں اس کی بابت اپنے تاثرات کا نہایت نپے تلے الفاظ میں اظہار کیا۔

بعد میں عالمگیر پر فارسی کے ۲۶ اشعار لکھے اِن اشعار سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جادو ناتھ سرکار کے اس زہریلے پروپیگنڈے کا ازالہ کیا ہے جو عام مسلمانوں تک پہنچایا گیا ہے۔

شاہِ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبار دودمان گورکاں
پایۂ اسلامیانِ برتر ازو
احترامِ شرع پیغمبر ازو

مدراس سے واپسی

جب اقبال ۱۹۲۸ء کے آخر میں مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر مدارس جارہے تھے۔ ان کو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے فلسفہ پر توسیعی تقاریر کے سلسلے میں دعوت دی گئی تھی جس کو انہوں نے قبول کرلیا تھا۔ چنانچہ جب وہ میسور یونیورسٹی کی دعوت پر ۲۱ جنوری ۲۹ء کو بنگلور پہونچے تو وہاں ان کو ایک تار کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وزیر مالیات حیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری) نے ان کے قیام کے لئے دِلکشا میں انتظام فرمایا ہے۔ چنانچہ جب ۱۴ جنوری کی صبح کو اقبال کی ٹرین حیدر آباد کے مشہور ریلوے اسٹیشن سکندر آباد پر رُکی تو انہوں نے دیکھا کہ تین چار سو سے زائد چھوٹے چھوٹے اور معصوم بچے

خوبصورت یونیفارم میں ملبوس قطار اندر قطار کھڑے ہو کر ان کا ملّی ترانہ "چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا" خوش الحانی سے پڑھ رہے ہیں۔

ولادواوسٹا میں قیام

سب سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبا اور عہدے داروں نے اقبال کا استقبال کیا، استقبال کرنے والوں میں سر اکبر حیدری، یونیورسٹی کے رجسٹرار مسٹر انصاری، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا عبداللہ عمادی، ابراہیم ٹونکی اور ڈاکٹر مظفر الدین قریشی پیش پیش تھے۔ سر اکبر حیدری نے اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے، پھر دوسرے لوگوں سے متعارف کرایا۔ جب یہ تعارفی رسم ختم ہوئی تو اقبال کو بتایا گیا کہ حکومت نے ان کی قیام گاہ کے پروگرام میں تبدیلی کر دی ہے۔ اب وہ دلکشا کے بجائے سرکاری مہمان کی حیثیت سے "ولادواوسٹا" شاہی مہمان خانے میں قیام کریں گے۔ چنانچہ اقبال کو کاروں کے ہجوم میں شاہی مہمان خانے پہونچایا گیا جہاں ان کے عقیدتمندوں، مداحوں اور پرستاروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

مہاراجہ کی تعارفی تقریر

اقبال نے حیدرآباد میں دو لیکچر انگریزی زبان میں دیئے۔ ان کے پہلے لیکچر کی صدارت مہاراجہ کشن پرشاد نے اور دوسرے لیکچر کی صدارت نواب اعظم جاہ، ولی عہد سلطنت نے کی۔ پہلا لیکچر ۱۵ جنوری کو باغ عامہ کے ٹاؤن ہال میں ہوا۔

مہاراجہ نے اس کی صدارت کرتے ہوئے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا:

"جامعہ عثمانیہ کی دعوت سر اقبال کی عالمانہ تقریر کے سلسلہ میں اِس لیکچر کی صدارت میرے لئے خوش گوار فریضہ ہے۔ اس موقع پر صدارت کا فریضہ میرے لئے آسان یوں ہوگیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے تعارف کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس ملک کا ہر کہ دمہ آپ سے واقف اور آپ کے کلام سے اس مجمع کا ہر فرد اپنی استعداد اور شوق کے مطابق قدرداں ہے۔ آپ کی ذات تعارف سے مستغنی اور آپ کا کلام ستائش سے بالاتر ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی تصنیفات کے انمول اور وسیع گنجینوں کا ایک لامتناہی تصور پیشِ نظر ہوجاتا ہے کہ عرض کلام سے گذر کر جوہر بیان میں فکرِ سخن در غلطاں و پیچاں ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال جس مقصدِ حیات کو اپنے علم و عمل سے پورا کر رہے ہیں۔ وہ انسانی ترقی کو دنیا کے لئے سود مند بنانے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال تصوف اور عرفان کی آغوش میں پل کر حکیم ہوئے ہیں اور ان کے حکیمانہ خطبات سے ہم سب کو یکساں مستفید ہونے کا اب بالمشافہ موقع ملا ہے جس کی ہم عزت اور قدر کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اس مجمع کا ہر برنا و پیر اپنی معلومات میں قابلِ قدر اضافہ کریگا۔"[1]

مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنی اس تقریر کے بعد اقبال سے درخواست کی کہ وہ اپنے مداحوں، پرستاروں اور عقیدت مندوں کو اپنے خیالات سے شاد کام فرمائیں چنانچہ اقبال نے اپنی قدر افزائی کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا وہ لیکچر پڑھا جو وہ مدارس میں سُنا چکے تھے۔

---

[1] ۔ شاد و اقبال۔ محی الدین قادری

اقبال کے اعزاز میں مشاعرہ

مہاراجہ کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی شاعر ہندوستان سے حیدر آباد آتا تھا تو وہ اس کے لئے مشاعرے کا انعقاد کرتے تھے۔ اقبال کی حیدر آباد تشریف آوری کے موقع پر ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اقبال کے اعزاز میں مشاعرہ اہتمام نہ کریں۔ اس زمانے میں اقبال نے مشاعروں میں پڑھنا ترک کر دیا تھا اور ان کی حیثیت ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے مسلم ہو گئی تھی لیکن مہاراجہ کی پاسداری اور لحاظ کی وجہ سے وہ مشاعرہ میں شریک ہونے سے انکار نہیں کر سکے چنانچہ ۱۵ جنوری کی رات کو مہاراجہ کی کوٹھی پر ایک پُر تکلف ضیافت اور مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا اور تمام مدعوئین کو ہدایت کی گئی کہ وہ آصف جاہی دستار اور بگلوس کے بغیر مشاعرہ میں نہ آئیں۔ اردو اور فارسی کے تمام ہی مشہور شعراء نے دستار اور بگلوس کے ساتھ مشاعرہ میں شرکت کی۔ مجلہ عثمانیہ (مہاراجہ نمبر) کے ایک مقالہ نگار نے "مہاراجہ یمین السلطنت آنجہانی کے مشاعرہ" کے عنوان سے اس مشاعرہ کی روداد یوں قلم بند کی ہے۔

"اقبال کی تشریف آوری کے موقع پر جو مشاعرہ ہوا وہ بھی عجیب مشاعرہ تھا سر مہاراجہ نے اعلیٰ پیمانے پر دعوت اور مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا حیدر آباد کے تمام مشہور فارسی اور اردو کہنے والے شعراء موجود تھے چونکہ کوئی خاص طرح مقرر نہ تھی اس لئے حیدر یار جنگ طباطبائی، نواب ضیاء یار جنگ بہادر، نواب عزیز یار جنگ بہادر، مولوی مسعود علی محوی جوش ملیح آبادی، نظام شاہ لبیب تیموری، میر کاظم علی باغ سے متعدد اور مستند شعرا نے اپنے خیال میں اپنا بہترین کلام سنایا مگر

اقبال ٹس سے مس نہ ہوئے۔ صرف محوی صاحب کے اس شعر پر

نگاہ کردن دزدیدہ ام بہ بزم بہ دید
میان چیدن گل باغباں گرفت مرا

اتنا ارشاد ہوا کہ پھر پڑھئے۔ جب ان سے خود پڑھنے کی فرمائش کی گئی تو بڑے اصرار کے بعد چار پانچ شعر سنائے" [1]

میسور کے ایک تحقیق نگار سلیم تمنائی نے اپنے ایک مقالہ میں اس مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے اقبال سے بعض ایسے جملوں کو منسوب کر دیا ہے جو کسی صورت میں بھی ان کے نہیں ہو سکتے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت جوش ملیح آبادی دارالترجمہ کے ناظم تھے۔ آپ کے حسن انتظام سے مہاراجہ کشن پرشاد کی حویلی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جب ڈاکٹر صاحب سے اصرار ہوا اور مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی فرمایا کہ سنا دیجئے نا اقبال صاحب! تو لوگوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ نے صاف انکار کر دیا، اصرار بڑھا تو فرمایا، میں تمہیں سلطنت دینا چاہتا ہوں اور تم مجھ سے شاعری کا مطالبہ کرتے ہو" [2]

مولانا غلام رسول مہر نے اقبال سے ان جملوں کے انتساب کو نادرست بتایا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی جو اس سفر میں اقبال کے ہم رکاب تھے ان کے بیان سے بھی اقبال کے ساتھ ان جملوں کے انتساب کی تکذیب ہوتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

"مہاراجہ کشن پرشاد کے ہاں رسمی دعوت تھی جس میں تمام مدعوئین نے ریاست کے سرکاری لباس میں شرکت کی۔ اس لئے میں اس دعوت میں علامہ کے ساتھ نہیں گیا۔ اگرچہ علامہ نے اعلان کر دیا تھا

---

[1] مجلہ عثمانیہ۔ مہاراجہ نمبر [2] داستانے از دکن آوردہ ام (غالب نامہ)

کہ وہ کوئی شعر یا نظم اس دعوت میں نہیں پڑھیں گے مگر وہاں کے
کے ماحول کو دیکھ کر آپ نے بھی محفل شعر و سخن میں حصہ لیا اور کچھ
اشعار سنائے۔"[۲]

عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ کیمیا کے پروفیسر ڈاکٹر مظفر الدین قریشی نے بھی شرکت کی تھی۔ وہ اقبال کے دوستوں اور پرستاروں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے اکثر احباب سے اِس مشاعرہ کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعرہ میں یہ شعر پڑھے تھے۔[۳]

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اَے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو باہمہ رو
آں نگینے کہ تو با ابر میناں ساختۂ
ہم بہ جبریلِ امینِ ناتواں کرد گرو

نظام سے ملاقات

ابھی اقبال اس مشاعرہ سے لوٹے بھی نہیں تھے کہ رات کے نو بجے کے قریب سر امین جنگ نے اِن کی قیامگاہ پر ایک خط بھجوایا جس میں کہا گیا تھا کہ حضور نظام نے کال بک پر آپ کا نام ملاحظہ فرمانے کے بعد ۱۸ جنوری کی صبح کو گیارہ بجے کا وقت ملاقات کے لئے مقرر فرمایا ہے جب وہ مشاعرہ سے لوٹے تو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین نے ان کو اس خط کے موصول ہونے کی اطلاع دی اور بتایا کہ اب ان کے لئے ۱۹ جنوری سے پہلے لاہور کیلئے روانہ ہونا ممکن نہیں ہوگا۔[۱]

۱۷ جنوری کو سر اکبر حیدری نے اقبال کو دوپہر کے وقت کھانے کی دعوت

۲۔ اقبال کی صحبت میں۔ عبداللہ چغتائی ص ۳۔ نقش اقبال۔ عبدالواحد معین

دی۔ اس دعوت میں عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس دعوت میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور محکمہ مالیات کے عہدہ داروں کے علاوہ اور کئی ممتاز شہریوں نے شرکت کی۔ دعوت کے اختتام پر سر اکبر حیدری نے اقبال کا بعض لوگوں سے خاص طور پر تعارف کرایا ان میں عبدالرزاق راشد بھی تھے جنہوں نے بانگ درا کی اشاعت سے بہت پہلے اقبال کا کلیات طبع کرایا تھا۔ اس کے بعد مختلف ملکی و قومی اور سیاسی مسائل پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اس موقع پر اقبال نے ادارۂ معارف اسلامیہ کی امداد کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں۔

"اقبال نے سر اکبر حیدری سے بھی اس ادارے (ادارۂ معارف اسلامیہ) کے سلسلہ میں مشورہ کیا اور انہیں اغراض و مقاصد کا کتابچہ دکھایا۔ مقدمہ یہ تھا کہ سرکار نظام کو اس ادارے کی افادیت پر متوجہ کر کے مالی امداد کی درخواست کیجائے۔[۲]"

اس موقع پر سلاطینِ قطب شاہی کی علم دوستی کے واقعات بھی زیرِ بحث آ گئے اِس موقع پر سر اکبر حیدری نے اقبال سے یہ اصرار کیا کہ وہ اگر گولکنڈہ اور دوسرے تاریخی مقامات کی سیر کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سلسلے میں انتظام کر دیا جائے۔ اقبال نے اس خیال سے معذرت کر لی کہ وہ اپنے ملنے والوں کی ملاقات سے محروم رہ جائیں گے۔ البتہ عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین ایک سرکاری کار میں گورستان شاہی اور گولکنڈہ کی سیاحت کے لئے روانہ ہو گئے۔

امین جنگ کا استقبالیہ

اِسی رات سر امین جنگ نے جو حضور نظام کے پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ اقبال

۲۔ اقبال کی صحبت میں۔ عبداللہ چغتائی۔

کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ اس عشائیہ میں حیدرآباد کے بیشتر جاگیرداروں اور رؤسا نے شرکت کی۔ اس عشائیہ کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا کہ اقبال کو حضور نظام کے آداب سے آگاہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ ان سے ملاقات کے وقت کون کون سی باتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی اقبال کو اس امر کی بھی مبارکباد دی گئی کہ ان سے پہلے کسی ہندوستانی شاعر کو حضور نظام نے اتنا بڑا اعزاز نہیں دیا ہے۔

محمد صالح سے ملاقات

دوسرے روز مولوی محمد صالح نے نذیر یار جنگ کے ہمراہ اقبال سے ملاقات کی اور تحریک قرآنی کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ اقبال کے ایک ہم رکاب مقالہ نگار نے لکھا کہ:

"جب مولوی محمد صالح اقبال سے ملنے کے لئے آئے، اُنہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور دیر تک علامہ کے ساتھ قرآن کریم کے رموز پر گفتگو کرتے رہے تھے اِس زمانے میں وہ انگریزی اور اردو زبان میں ایک نہایت بلند پایہ مجلہ "دی قرآنک ورلڈ" نکالا کرتے تھے جس کے مضامین اہلِ علم میں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔"

"اقبال نے مولوی محمد صالح کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے ان سے پوچھا پہلے یہ بتائیے کہ قرآن کون پڑھائے گا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا: حقیقی معنوں میں قرآن پڑھانے والوں کی بہت کمی ہے لیکن آپ مجھے قرآن قرآن کرنے دیجئے کیونکہ حسب منشا قرآن پڑھنے والے بھی قرآن ہی سے پیدا ہوں گے۔[۱]"

۱۔ اقبال اور قرآن، مولوی محمد صالح

نظام کا فرمان

سلیم تمنائی اور اسی قبیل کے دوسرے حاشیہ نگاروں کے بیانات کی تکذیب نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے اس فرمان شاہی سے ہوتی ہے جو انہوں نے اقبال سے ملاقات کے بعد جاری کیا تھا اور اپنی رعایا کے علم میں یہ بات لائی تھی کہ وہ اقبال کو کیا سمجھتے ہیں اور ان کی ملاقات کس طرح ہوئی تھی۔ ہم اس فرمان کو پہلی مرتبہ ذیل میں درج کر رہے ہیں تاکہ ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے جو نظام اور اقبال کے درمیان بعض اختراپردازوں نے پھیلا رکھی ہیں۔

"مارا ایں قدر یاد ہست کہ تخمیناً عرصہ ربع صدی گذشتہ است کہ ایکبار ایں جا آمدہ بود مگر معلوم نیست کہ آیا او از خود بغرض سیر و سیاحت آمدہ یا برو دعوت کسے یا برائے کار خاص آمدہ و ہم او چونکہ برما کال (CALL) کردہ بود یعنے نام خودش در کتاب نوشتہ بود حسب عادت مطابق ایٹیکیٹ ما او را انٹرویو دادہ بودیم و نتیجہ کہ ما از گفتگوئے او اخذ کردیم آں ایں بود کہ او در نظر ما از معززطبقۂ اہل اسلام آمدہ و ایں ہم از طرز کلام او برما ہویدا شد کہ او جذبۂ خدمت قوم و ملت خویش در دل می داشت و ایں ہم ظاہر شد کہ او زبان انگریزی را خوب می دانست و سفر یورپ ہم کردہ بود بہر حال شمار او در میان مشاہیر بیرون ملک بود۔ زیادہ از احوال او ما نابلد ہستیم"۔

(نظام گزٹ۔ ۴ مئی ۱۹۴۴ء روز پنجشنبہ)

۱۸ جنوری کو صبح گیارہ بجے اقبال کی نظام سے ملاقات کن حالات میں ہوئی؟ کیا مسائل زیر بحث آئے اس پر اخفا کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کے باوجود اقبال کے بعض نادان دوستوں نے اس سلسلہ میں ایسی داستان

طرازی کی ہے اور اس واقعہ کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کا مطلق العنان فرمانروا ایک معمولی حیثیت کا آدمی نظر آتا ہے۔ سلیم تمنائی صاحب فرماتے ہیں۔

"ڈاکٹر اقبال آصف جاہی دستار اور بگلوس کے بغیر حضور نظام کے حضور پہونچے اور رموز بے خودی کا ایک نسخہ گذرانتے ہوئے ایک فارسی نظم پیش کی اور حضور نظام کے اس بیش بہا ہیرے کو دیکھنے کے خواہشمند ہوئے جس کی خبر انہیں حکیم اجمل خاں نے دی تھی۔ تاجدار دکن نے فوراً حکم صادر فرمایا اور اقبال نے اس چمکتے دمکتے آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والے حسین مادی ید بیضا کو دیکھ کر شکریہ ادا کیا۔

اقبال صاحب! حضور نظام نے فرمایا۔ ہم سالِ گذشتہ دہلی آئے تھے۔ دہلی سے لاہور نہایت قریب ہے لیکن آپ ہماری ملاقات کو نہیں آئے۔ حضور! اقبال نے جواب دیا۔ اقبال تو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی تھا لیکن یہ جسمانی اقبال ان دنوں بیمار تھا اس لئے حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ اس سہو کی تلافی کر کے اب ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کر کے حاضرِ خدمت ہوا ہے۔" آپ قبول فرمائیں تو ہم آپ کو اسٹیٹ کا وزیر قانون بنا دیں"۔ حضور! اقبال نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ اقبال کو آزاد ہی رکھیں تو بہتر ہوگا اس قسم کی سرکاری ذمہ داریوں کی تکمیل کے لئے میں اپنے آپ کو موزوں نہیں پاتا۔"

جو لوگ نظامِ دکن کی حیثیت اور رتبہ و عظمت سے واقف ہیں، وہ ان مکالموں پر مشکل ہی سے یقین کریں گے۔ سلیم تمنائی نے یہ مکالمے، بنگلور سے

شائع ہونے والے ایک رسالے الکلام کے مدیر سید غوث محی الدین کے حوالے سے نقل کئے ہیں اور بغیر تحقیق کے ان کو صحیح سمجھ لیا ہے۔ غوث محی الدین صاحب جن کو اقبال سے پوری شناسائی بھی نہیں اور جو نظام کے مرتبے سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں اِن کو یہ تو علم ہونا چاہیئے تھا کہ نظام سے کسی کی ملاقات کے وقت تیسرے شخص کی موجودگی ممکن ہی نہیں تھی پھر انہوں نے کہاں سے سُنا، کس سے سُنا اس سلسلہ میں بھی کچھ نہیں بتایا اس سے واقعہ کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے مستند بیان اقبال ہی کا ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"مجھے حیدر آباد دکن جانے پر حضور نظام کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ بالمشافہ گفت و شنید میں میں نے عرض کیا کہ مسلمانان پنجاب جناب کی تشریف آوری کے متمنّی ہیں اور عرصہ سے چشم براہ ہیں کہ ان کی یہ اُمید بر آئے چنانچہ یہ گفتگو جناب کے پنجاب میں نومبر آئندہ میں تشریف لانے کا پیش خیمہ ہوئی"[1]

چنانچہ اقبال نے لاہور پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ۲۳ جون ۲۹ء کو انجمن حمایت الاسلام کی جنرل کونسل کے اجلاس میں کہا کہ

"اعلیٰ حضرت نظام سے مسلمانان پنجاب کو بحیثیت فرماں روا ہونے کے دلی عقیدتمندی ہے۔ اعلیٰ حضرت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد سے ہیں۔ چنیوٹ پنجاب کے نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہ جہاں سے بھی اعلیٰ حضرت کو نسبی تعلق ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر مسلمانان پنجاب کو اپنی عقیدت

---

[1] اقبال اور انجمن حمایت الاسلام

مندی کا ثبوت اعلیٰ حضرت کے شاندار خیر مقدم کی صورت میں دینا چاہیئے۔"

اس کے چند روز بعد حضور نظام کا تار اقبال کے نام آیا جس میں تحریر کیا گیا تھا۔

آپ کا خط مورخہ ۱۰ مئی کو ملا آئندہ موسم سرما میں میری آمد کے متعلق میرے ہم مذہب باشندگان لاہور نے جن دوستانہ اور وفادارانہ جذبات کا اظہار کیا ہے، میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے، میں اپنے ارادے سے بروقت آپ کو اطلاع دوں گا۔ "نظام"

اس کے بعد ایک اور خط موصول ہوا

" مجھے سردست اس بات کا یقین نہیں ہے کہ حسبِ توقع نومبر یا دسمبر میں وہاں آسکوں گا۔ اس لئے کہ میں اس سال کے خاتمہ پر اپنے جواں عمر شہزادوں کی شادی پر غور کر رہا ہوں۔ علاوہ بریں ہز ایکسیلنسی وائسرائے بھی دسمبر میں تشریف لا رہے ہیں لہٰذا اندیشہ ہے کہ یہ واقعات میرے ارادے میں مزاحم ہوں تاہم میں ستمبر یا اکتوبر میں قطعی طور پر اس معاملہ میں اطلاع دے سکوں گا۔ فی الحال کوئی فیصلہ کن بات کہہ دینا قبل از وقت ہے۔"

بعد میں نظام نے ناگزیر مجبوری کے باعث پنجاب کا سفر ملتوی کر دیا

ڈاکٹر عبداللطیف حیدر آباد میں

اقبال کی شخصیت اور کلام کا نقش اہل حیدر آباد کے دل پر بہت گہرا تھا وہ ان کے افکار و نظریات کی روشنی میں اپنے سیاسی مسائل کو حل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۱ اکتوبر ۳۷ء کو عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر عبداللطیف

نے لاہور جاکر اقبال سے ملاقات کی اور ان سے اس موضوع پر مشورہ حاصل کیا کہ مسلمان کس طرح اپنے حقوق کا دفاع کرتے ہوئے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اقبال نے ان کو کیا مشورہ دیا، اس کی تفصیل ہمارے سامنے نہیں ہے البتہ ڈاکٹر عبداللطیف نے حیدرآباد واپس آنے کے بعد مسلم کلچرل سوسائٹی حیدرآباد کی داغ بیل ڈالی اور اس سوسائٹی کا پہلا صدر نواب فخر یار جنگ بہادر کو بنایا گیا جو نواب مشتاق احمد خاں کے والد بزرگوار تھے۔ اس سوسائٹی کے عہدہ داروں میں سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالقدیر صدیقی اور دوسرے کئی مشاہیر شامل تھے ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنے ایک مضمون میں اس سوسائٹی کے قیام اور اغراض و مقاصد کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"حیدرآباد واپس ہونے کے بعد میں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے احباب کے تعاون سے مسلم کلچرل سوسائٹی حیدرآباد کے نام سے مخصوص اصحابِ علم پر مشتمل ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد اسلامی تہذیب کا تحقیق و مطالعہ تھا۔ اس نو تشکیل ادارے کے زیر اہتمام ہندوستان بھر میں سب سے پہلا یوم اقبال حیدرآباد میں منایا گیا۔ اس یوم کے انعقاد سے مقصود یہ تھا کہ ایسے وقت میں جب ان کی (اقبال) عمر کا جہاز کنارے آلگا تھا ان کی خاطر جمعی اور دل بڑھانے کا یہ کچھ سامان کیا جائے۔" ؎۱

پہلا جشنِ اقبال

نواب فخر یار جنگ اور ڈاکٹر عبداللطیف کی ذاتی کوششوں سے یوم اقبال

؎۱۔ "اوراقِ گم گشتہ"

شاندار طریقے پر منانے کی تیاریاں نومبر کے اوائل ہی سے شروع کر دی گئیں ۷ جنوری ۳۸ء کو اس یوم کے دو اجلاس باغ عام کے ٹاؤن ہال میں منعقد کئے گئے۔ اِن دونوں اجلاسوں میں مندوبین اور مہمانوں کے علاوہ سامعین کا زبردست اجتماع تھا۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق کم سے کم چھ ہزار افراد نے شرکت کی۔ اس یوم کے پہلے اجلاس کا افتتاح نظام دکن کے ولی عہد شہزادہ برار پرنس نواب اعظم جاہ بہادر نے کیا۔ ان کی افتتاحی تقریر نظام حیدرآباد کی جانب سے اقبال کی عظمت اور بزرگی اور ملتِ اسلامیہ کی خدمات کا واضح اعتراف تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اُقبال نے اپنے فارسی اور اُردو کلام سے موجودہ نسل کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ بجا طور پر وہ دُنیا کے ایک بہت بڑے مفکر اور مصنّف ہیں۔ ان کی شاعری بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام کی حیثیت رکھتی ہے یہی وہ خصوصیات ہیں جن کا حیدرآباد اعتراف کر رہا ہے"

ولی عہد کی افتتاحی تقریر کے بعد سر اکبر حیدری جن کے لئے اقبال نے 'حیدری اندر لباس عنتری' کا طعنہ دیا تھا، اپنی تقریر میں کہا۔

"اقبال کی شاعری فلسفہ، تصوّف اور قومیت کا امتزاج ہے۔ ایسے شاعر کا یوم منانے کے لئے سوائے حیدرآباد کے اور کوئی مقام موزوں نہیں ہو سکتا جہاں اُردو اور فارسی بڑے طبقوں کی زبان خیال کی گئی ہے اور جہاں ایک ایسا تاجدار موجود ہے جس کے تخیّل اور دلی جذبات کو ہم ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد کے رہنے والے اپنے لئے آئینہ ہدایت سمجھتے ہیں۔ اس یوم کی صدارت کے لئے اس تاجدار شاعر کے ولیعہد سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا ہے"۔

سر اکبر حیدری کی مختصر سی تقریر کے بعد ہز ہائی نس سر آغاں، پنڈت جواہر لعل نہرو، سروجنی نائیڈو، سکندر حیات خاں، نواب حمید اللہ خاں، نواب حامد علی خاں، آنریبل سر غلام حسین، آنریبل سر یعقوب حسن، عبد اللہ بریلوی جسٹس منوہر لال، رابندر ناتھ ٹیگور، سر مرزا اسمعیل اور دوسرے مشاہیر کے پیغامات سُنائے گئے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت مہاراجہ کشن پرشاد نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا۔

"اردو شاعری کے اس جنم بھوم میں آج کا دن حقیقت میں ایک یادگار دن ہے کیونکہ آج ہم اقبال جیسے مشہور و مقبول شاعر کی خصوصیات کی داد و تحسین کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مجھے اس امر کی مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسہ کے دوسرے اجلاس کی صدارت کا اعزاز مجھے عطا کیا۔ میرے اقبال سے ذاتی تعلقات بھی ہیں۔ یہی تعلقات مجھے اپنی کم نظری کے باوجود اس کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔"

اس یوم سے پہلے ہندوستان میں اِتنا بڑا کوئی ادبی اجتماع نہیں ہوا تھا یہ فخر صرف حیدر آباد کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اقبال شناسی کی روایت ڈالی اور اس کو اپنے خلوص، محبت اور لگن کی بدولت ہندوستان بھر میں عام کیا اس موقع پر اخباروں میں تفصیلی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ رسالوں اور جریدوں نے اقبال نمبر نکالے، ڈاکٹر عبد اللطیف کہتے ہیں۔

"حیدر آباد کے اصحاب علم نے اقبال کے تعلق سے اس درجہ عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا کہ نظام سابع کے ولی عہد نے خود اس جشن کے افتتاح کے لئے آمادگی ظاہر فرمائی اور مہاراجہ سر کشن پرشاد نے جو ان دنوں حیدر آباد کے وزیر اعظم تھے اس کی صدارت کی اس

جشن کے داعی کی حیثیت سے میں نے بھی اس موقع پر ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا "عالم انسانی کی وحدت اقبال کی نظر میں"۔

یہ جشن ۷ جنوری ۳۸ء کو منایا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے اقبال کو اس سلسلہ میں شائع ہونیوالے اخبارات کے تراشے اور روداد میں ارسال کی تھیں۔ نذیر نیازی جنہوں نے اقبال کے آخری ایام کی تفصیل ایک کتاب میں لکھی ہے جسمیں نہ اسکا ذکر کیا ہے نہ اس کی کامیابی کا۔ اقبال نے ڈاکٹر عبداللطیف کے نام ایک خط ارسال کیا تھا جس میں حیدرآباد کے رہنے والوں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبداللطیف کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

"جشنِ اقبال ۷ جنوری ۳۸ء کا واقعہ ہے۔ اس پہلے جشن کی روداد میں اخبارات کے تراشوں کی صورت میں ڈاکٹر اقبال کو بھیجی گئیں۔ انہوں نے اس موقع پر جو خط ہمیں لکھا اس میں اپنے اس اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنے مستعد افراد کا ایک ایسا گروہ چھوڑ کر جا رہے ہیں جو ان کی جلائی ہوئی مشعل کو روشن رکھے گا۔ یہ خط مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

حیدری سے اقبال کی بدگمانی

اس جشن کے موقع پر سر اکبر حیدری نے (اقبال کی اُن بدگمانیوں کے باوجود جو ان کو حیدری صاحب سے تھیں) حضور نظام کی جانب سے اقبال کی خدمت میں ایکہزار روپے کی رقم چیک کی صورت میں بھجوائی چونکہ اس چیک کے ساتھ ہی ایک سلپ پر لکھا ہوا تھا کہ یہ رقم نظام کے توشہ خانے سے دی گئی ہے۔ اقبال نے اس چیک کو لوٹاتے ہوئے سر اکبر حیدری کے نام ایک قطع لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حیدرآباد میں "توشہ خانہ" کی اصطلاح صرف خاص کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اس سے یہی مطلب ہوتا تھا کہ یہ رقم نظام کی ذاتی آمدنی سے ہے۔ لیکن اقبال کے عاقبت نا اندیش حاشیہ نشینوں نے "توشہ خانے" کو خیرات خانے کے مترادف بنا دیا اور ان کے دل میں یہ بات جاگزیں کر دی کہ یہ رقم ان کو بطور خیرات دی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی یہ رقم — آفتاب اقبال کی تعلیم اور ادارہ معارفِ اسلامیہ کے لئے اسی توشہ خانے سے دی گئی تھی اور اقبال کے حاشیہ نشینوں کو اس پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سلسلہ میں نواب معین نواز جنگ کا یہ بیان بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک ہندو کلرک کی غلطی کی وجہ سے توشہ خانہ والی سلیپ چک کے ساتھ چلی گئی۔

اقبال کی وفات

اس واقعہ کے تین ماہ بعد ۲۱ اپریل ۳۸ء کو اقبال کا انتقال ہو گیا۔ ابتدا میں سر سکندر حیات نے ان کو شاہی مسجد کے سیڑھیوں کے قریب دفن کرنے کی اجازت نہیں دی لیکن بعد میں بڑی کوششوں کے بعد ان کو شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس سپردِ خاک کیا جا سکا۔

جلسۂ تعزیت

اقبال کی وفات کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ پورے ملک میں کہرام برپا ہو گیا۔ حیدرآباد کے شب و روز غم و اندوہ کی فضاؤں میں ڈوب گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی

اور دوسرے علمی اداروں نے تعزیتی جلسے منعقد کئے جن میں کئی قرار دادیں منظور کی گئیں جن میں نظام دکن سے درخواست کی گئی کہ وہ اقبال کے لواحقین کی مالی مدد فرمائیں۔ اسی کے ساتھ حیدرآباد کے مختلف اضلاع رائچور، گلبرگہ ورنگل، بیدر وغیرہ میں بھی تعزیتی جلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، بوڑھے، جوان مرد، بچے اور عورتیں یوں دھاڑیں، مار مار کر روتی تھیں جیسے ان ہی کے گھر میں میت ہو گئی ہے

مسلم نوجوانانِ دکن کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے اپنے اجتماعات کے ذریعے اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے ہی کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس کے ذریعے سیاسی اور سماجی بیداری کا کام بھی لیا تھا۔ چنانچہ اس کی اپیل پر حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں اور اہلِ کمال نے اقبال کی یاد میں ایک بہت بڑے تعزیتی جلسہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ وہ شہر کے سب سے بڑے سینما گھر یعنی زمرد محل میں یہ جلسہ منعقد کریں تاکہ اس میں شہر کے تمام مکتبۂ فکر کے لوگ بھاری تعداد میں شرکت کر سکیں۔

اس جلسہ تعزیت کی صدارت کے لئے کسی موزوں شخص کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا تو لوگوں نے رائے دی کہ یہ حق صرف مسز سروجنی نائیڈو ہی کا ہے کیونکہ وہی اقبال سے زیادہ قریب رہی ہیں اور ان کو طالب علمی کے زمانے سے دیکھا ہے۔ وہی ان کے مرض الموت کے وقت ان کی عیادت کے لئے لاہور گئی تھیں۔ سروجنی نائیڈو کا اقبال کی ناگہانی رحلت سے برا حال تھا۔ جب لوگ انتہائی حزن و ملال کی حالت میں مسز سروجنی نائیڈو سے صدارت کی درخواست کرنے ان کی قیام گاہ پر پہونچے تو وہ غم سے حد درجہ نڈھال ہو چکی تھیں۔ انہوں نے تھکے تھکے قدموں سے باہر آکر درد و کرب سے لبریز آواز

میں لوگوں کو تسلی دی اور کہا کہ جب تک اقبال کا پیام عمل باقی ہے، میری قوم یتیم نہیں ہوگی۔ چنانچہ جس روز وہ اقبال کے جلسۂ تعزیت کی صدارت کرنے بلکہ بہ الفاظ دیگر یتیم قوم کے سر پر دستِ شفقت رکھنے کے لئے زمرد محل میں تشریف لائیں، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کو اپنے اندرونی کرب پر قابو نہیں ہے۔ انہوں نے انتہائی حزن و یاس کے عالم میں کرسئ صدارت سنبھالی اور جلسہ کا آغاز کیا۔

اس جلسہ کا آغاز نظام دکن کے ولی عہد نواب اعظم جاہ کے پیغام سے ہوا۔ جس میں انہوں نے پوری قوم سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اقبال کی رحلت پوری قوم کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس موقع پر نواب معظم جاہ سر اکبر حیدری، سر مرزا اسماعیل، سر سکندر حیات خاں، سر غلام حسین ہدایت اللہ راجہ صاحب محمود آباد، ڈاکٹر سید محمود، قائد اعظم، مرزا عزیز یار جنگ سر امین جنگ نے بھی اپنے تعزیتی پیغام بھجوائے تھے۔

مسلمان ہوں یا ہندو، سکھ ہوں یا عیسائی، پارسی ہوں یا شیڈول کاسٹ کے لوگ، سب ہی کو اقبال سے محبت تھی۔ چنانچہ جب تقریروں کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے پرتاب گیر جی نے ہندوؤں کی نمائندگی کی۔ راجہ پرتاب گیر جی اردو اور فارسی پر اچھا عبور رکھتے تھے۔ سروجنی نائیڈو کی محفلوں میں ان کو شریک ہونے اور اقبال کی شاعری پر گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہا تھا اس طرح وہ اقبال کے سچے پرستار تھے ان کے بعد کیقباد جنگ آگے بڑھے۔ ان کا شمار اردو اور فارسی کے عالموں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے بعد ہی نواب بہادر یار جنگ کے نام کا اعلان ہوا۔ بے اختیار لوگوں کی اشکبار نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں اور ہر شخص دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ

یہ سوچنے لگا کہ دیکھئے آج ان کا قائد اپنے اس محبوب شاعر کے بارے میں کیا کہتا ہے جس کے نظریات پر اس نے ملت اسلامیہ کی سیاست کی بنیاد رکھی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ بڑے پُر اعتماد رہنما اور باحوصلہ انسان تھے۔ وہ قوم کو یاسیت اور نا اُمیدی کی منزل سے نکالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے اندرونی جذبات کو بڑی شدت کے ساتھ روکا اور اپنی بے پناہ خطابت کا مظاہرہ کیا۔

نواب بہادر یار جنگ کے بعد نواب مہدی یار جنگ نے تقریر کی پھر ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور خلیفہ عبدالحکیم نے مقالے پڑھے۔ اس جلسہ میں سکندر علی وجد مخدوم محی الدین، ماہر القادری، شاہد صدیقی، عبدالقیوم باقی، علی احمد جلیلی، صاحبزادہ میکش اور دوسرے شعراء نے نظمیں سنائیں۔

دوسرا باب

کچھ حسن یار جنگ کے بارے میں

حیدر آباد کے جاگیرداروں میں امرائے پائے گاہ کے درجہ اور حیثیت کا کوئی امیر نہیں تھا۔ تمام ہی شاہزادیاں ان سے بیاہی جاتی تھیں اس طرح وہ خانوادۂ شاہی کے رکن ہو جاتے تھے۔ یہ فخر ان کو شروع ہی سے حاصل رہا ہے کہ انہوں نے سلاطین آصفی کے بعد، علم و ادب، شعر و سخن، مذہب و ملت اور ملک و قوم کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ پنجاب کے مشہور ناول نگار اور ڈرامہ نویس ادیب حکیم احمد شجاع نے ان کے بارے میں اپنی تصنیف خوں بہا میں تفصیل سے لکھا ہے

بہادر یار جنگ کا ایک یادگاری خط

۳۸ء میں جب نواب حسن یار جنگ لیڈز یونیورسٹی (انگلستان) میں زیر تعلیم تھے تو نواب بہادر یار جنگ کے ایک بھائی کے آریہ سماجیوں کے ہاتھوں شہید ہونے کی خبر پاکر نواب بہادر یار جنگ کو انگلستان سے ایک تعزیتی خط لکھا جس کے جواب میں نواب بہادر یار جنگ نے ہائیڈ پارک لیڈز لندن نواب حسن یار جنگ کو جو تفصیلی جواب لکھا اس سے اس قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جو نواب حسن یار جنگ اور ان کے خاندان کے بارے میں نواب بہادر یار جنگ کے دل

میں تھی۔

نواب بہادر یار جنگ لکھتے ہیں "آپ نے جس محبت اور خلوص سے یاد فرمایا اِس کے لئے دل سے ممنون ہوں۔ قطع نظر اس عام اسلامی تعلق کے جو ہمارے درمیان ہے، مجھے اور میرے خاندان کو آپ کے جلیل القدر خاندان سے جو نسبت و عقیدت رہی ہے اس کا یہی تقاضہ تھا کہ آپ اپنے نیازمندوں کو اس طرح یاد فرماتے۔ اس زمانۂ ابتلا میں حیدرآبادی مسلمان پر دوگونہ فرائض عائد ہوتے ہیں ایک فریضہ حفاظتِ دین اور دوسرا حفاظتِ ملک و سلطنت، حیدرآباد کی حد تک میں اِن دونوں کو جُدا نہیں سمجھتا اور نہ ہمارا مخالف ان دونوں کو جُدا کر رہا ہے۔ اس کی نظر میں مسلمانوں کی کمزوری سلطنت آصفی کی کمزوری ہے اور سلطنت آصفیہ کی خدانخواستہ تباہی اسلام اور مسلمانوں کی تباہی ہے۔ اس لئے سچّا مسلمان اور سچّا حیدرآبادی وہ ہے جو سر بکف ہو کر میدان میں آئے اور مسلمانوں کو منظم کر کے سلطنتِ آصفیہ اور اسلام دونوں کو بچائے۔ اس منصبِ جلیلہ کو تاریخ کے گذشتہ ادوار میں آپ کے عالی قدر اجداد نے سب سے زیادہ عمدگی سے ادا کیا اور مخدوم خلائق بنے۔ آئندہ بھی ملک اپنے مستقبل کے لئے آپ کے آستانے عالی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ کامیاب واپس آئیں اور ملک کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سنبھالیں۔ میں تو صرف اس وقت تک ہوں جب تک کہ صحیح آدمی پیدا نہ ہو جائے۔ آپ کے مکتوب گرامی کو اس توقع پر محفوظ کر رہا ہوں کہ شاید کسی دن اس کو آپ کی بارگاہ میں ملک و ملّت کے لئے وسیلہ بنا سکوں"۔

نواب حسن یار جنگ ریاست حیدرآباد کے اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا حالی، شبلی نعمانی اور دوسرے اکابرین نے برسوں ان کے آباواجداد

کے خوانِ نعمت پر زلہ ربائی کی ہے نواب صاحب نے سر وقار الامرا کے فرزند سلطان الملک کے ایوان رفیع میں ہوش سنبھالا اور ادب و شعر کے ماحول میں پرورش پائی۔ جن دنوں وہ نظام کالج حیدر آباد میں طالب علم تھے ان کے اُردو کے اُستاد آفتاب علی نے ان کو کلام اقبال کے مطالعہ کا شوق دلایا۔ آفتاب علی کو اُردو شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ اقبال کی شاعری ان کو بہت پسند آتی تھی۔ جب اقبال کا مسدس شکوہ و جواب شکوہ چھپ کر نیا نیا آیا تو انہوں نے اسے نواب حسن یار جنگ کو بھی یاد کرانے کی کوشش کی۔ جب نواب صاحب ۱۹۱۸ء میں علیگڑھ آئے تو ان کو اقبال کی شاعری کے علاوہ خواجہ حسن نظامی کی نثر نے بھی متاثر کیا۔ جب وہ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ان کا علمی اور ادبی ذوق اپنے ہمعصروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت اِن کے اُستاد تاریخ الاُمّت کے مشہور مصنف مولانا اسلم جے راج پوری تھے جنہوں نے ۱۹۰۶ء میں لاہور کا قیام ترک کر کے علیگڑھ کالج میں فارسی اور عربی کی مدرسی اختیار کر لی تھی اور کالج کے یونیورسٹی بن جانے کے بعد پروفیسر ہو گئے تھے۔

حسن یار جنگ، اسلم جے راجپوری اور اقبال

یوں تو مولانا اسلم کے قیام لاہور ہی کے زمانے سے اقبال سے دوستی چلی آرہی تھی لیکن ان کے اور اقبال کے درمیان علمی اور ادبی روابط اسرارِ خودی کی اشاعت ہی کے بعد قائم ہوئے۔ اسرارِ خودی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے شائع ہوتے ہی مختلف مذہبی اور علمی حلقوں میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس مثنوی میں اقبال نے افلاطون اور حافظ کو بُرا اور گوسفند کہا تھا۔

اور ان کی فکری خامیوں کی نشان دہی کی تھی اس کے جواب میں پیرزادہ مظفر احمد فضلی، حکیم فیروز الدین طغرائی اور کئی دوسرے بزرگوں نے جوابی مثنویاں لکھیں اور ایک لامتناہی بحث کا دروازہ کھول دیا۔ مولانا اسلم جے راج پوری سے یہ صورت حال دیکھی نہیں گئی۔ انہوں نے اسرارِ خودی اور اس کے جواب میں لکھی جانے والی مثنویوں پر رسالہ 'الناظر' میں ایک مفصل اور جامع تبصرہ لکھا اور حرف آخر کے طور پر یہ رائے دی کہ "ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ طبیعت نے جو مسلمانوں کی تنزلی کے اسباب و علل دریافت کرنے کی طرف توجہ دی تو یہ سراغ پایا کہ ملّتِ اسلامیہ سے قوتِ عمل مفقود ہو گئی ہے اور جو عمل، ولولہ اور جوش ملّت میں تھا نہیں رہا اور چونکہ ترقی کا مدار عمل پر ہے اس لئے پھر اسی قوت عمل کو زندہ کر کے ہم ترقی کر سکتے ہیں اور اسی قوتِ عمل کے احیاء کے لئے ضروری ہے کہ ہم کو اپنی ہستی کا بھی احساس نہ ہو۔ اس نظریہ کی تعلیم کے لئے انہوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔

حسن یار جنگ کی اقبال سے ملاقات

جب نواب حسن یار جنگ نے مولانا اسلم کا یہ تبصرہ پڑھا تو ان کی اقبال سے دلچسپی کہیں زیادہ ہو گئی اور وہ اس مثنوی کے پڑھنے کے بعد اقبال کے مزید گرویدہ ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کو مولانا اسلم کی زبانی کئی مرتبہ اقبال کے نظریات اور خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملا چنانچہ وہ اقبال سے ملاقات کے مشتاق ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں مولانا اسلم کو کسی کام کے سلسلہ میں لاہور جانا پڑ گیا اس موقع پر مسلم یونیورسٹی کے بعض طلبا کے ساتھ نواب حسن یار جنگ بھی ایک وفد کی صورت میں لاہور چلے آئے تاکہ اقبال سے شرفِ ملاقات حاصل ہو سکے مولانا

نے تمام طلبار کو اقبال کے دولت کدے کے باہر کھڑا کیا اور خود اندر جاکر ان کو اطلاع دی کہ مسلم یونیورسٹی کے کچھ طلبا ملاقات کے لئے خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اقبال نوجوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے بلا توقف تمام طلبہ کو اندر بلالیا اور بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ان سے گفتگو کی۔ نواب حسن یار جنگ نے اپنی ایک یادداشت میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جب اقبال کو یہ معلوم ہوا کہ میں حیدرآباد سے تعلق رکھتا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور کہا مجھے روشنی کے دو مینار نظر آتے ہیں ایک سرسید کا علیگڑھ اور دوسرا نظام کا حیدرآباد اور پھر انہوں نے تعلیم کے حصول پر زور دیتے ہوئے نصیحت کی کہ پڑھے جاؤ، اچھی تعلیم کے بغیر مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔"

یہ نواب حسن یار جنگ سے اقبال کی پہلی ملاقات تھی لیکن اس ملاقات کا ان پر نقش اس قدر گہرا ہوگیا کہ جب وہ علیگڑھ سے فارغ ہونے کے بعد مزید تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو انکی بیاض میں اقبال کی کئی نظمیں اور غزلیں موجود تھیں جہاں وہ ان کا بڑی توجہ اور انہماک سے مطالعہ کرتے تھے

جب ۱۹۲۹ء میں اقبال نے میسور سے واپس ہوتے ہوئے کچھ دنوں حیدرآباد کے شاہی مہمان خانے میں قیام کیا اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ اسلام کے بارے میں توسیعی تقاریر کیں۔ نواب صاحب انگلستان میں قیام پذیر تھے۔ مدتوں ان کو اس امر کا افسوس رہا کہ انہوں نے اقبال سے تفصیلی ملاقات اور ان کے خیالات و نظریات سے واقف ہونے کا بہت اچھا موقع رائیگاں کردیا ہے۔ اسی کے ایک دو سال بعد اقبال ۱۹۳۳ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں

شرکت کے لئے لندن آئے تو لندن میں اقبال کے اعزاز میں کئی جلسے ہوئے اور متعدد پارٹیاں دی گئیں۔ اقبال لٹریری سوسائٹی نے اقبال کے اعزاز میں ایک عظیم الشان پارٹی کا اہتمام کیا جس میں نیاز محمد خان نے سپاسنامہ پڑھا۔ ڈاکٹر نکلسن نے خیر مقدمی تقریر کی اور اقبال نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اسی طرح کیمبرج میں بھی اقبال کے اعزاز میں جلسہ ہوئے

حسن یار جنگ لندن میں

یہ گول میز کانفرنس ان نتائج کے اعتبار سے ناکام رہی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے مطالبات کا تذکرہ نہیں آنے دیا۔ مصالحتی کمیٹی بھی موثر انداز میں کام نہیں کر سکی جس کے نتیجہ میں اقبال کو سب سے زیادہ مایوسی ہوئی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اس گول میز کانفرنس کا مقصد مسلمانوں کے مستقبل کو تاریکی میں لے جانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے چنانچہ جب بہت سے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی طلبا نے جو کیمبرج اور آکسفورڈ میں پڑھتے تھے اقبال سے ان کی قیامگاہ پر ملاقات کی تو انہوں نے اس کے نتائج کے بارے میں بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ اسی دوران لیڈز یونیورسٹی سے نواب حسن یار جنگ نے لندن آکر اقبال کی خدمت میں حاضری دی وہ اس وقت بعض ہندوستانی طلبہ سے تبادلہ خیال میں مصروف تھے۔ نواب حسن یار جنگ کی یادداشت کے مطابق:

> "اقبال نے مجھ سے نظام اور ان کی ریاست کے بارے میں گفتگو کی پھر کہا، مجھے اس امر پر تشویش ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کو تاریکی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ ہم مسلمانوں کے حقوق الگ قوم کی حیثیت سے تسلیم کروانا چاہتے ہیں لیکن اس وقت برطانیہ اور کانگریس دونوں ہمارے دشمن ہیں۔ اس لئے ایسا نہیں ہو رہا ہے"۔

زین یار جنگ اور مزارِ اقبال

جب اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۴۰ء میں ان کے شایانِ شان مقبرہ کی تعمیر کا سوال پیدا ہوا تو مزار کمیٹی کے ارکان نے فنِ تعمیر کے تمام ہی ماہروں سے مشورہ کیا۔ جب کسی سے بھی اقبال کے تصورِ خودی اور نظریہ موت کی ترجمانی نہیں ہو سکی تو نواب زین یار جنگ سے رجوع کیا گیا۔

نواب زین یار جنگ کی اقبال سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اقبال کا حق اہلِ حیدرآباد پر زیادہ ہے اس لئے اُنہوں نے اس سلسلے میں پیش آنے والی کسی بھی دشواری کی پرواہ نہیں کی اور اپنے ذاتی خرچ پر لاہور پہونچ کر مقبرے کے تعمیری خاکے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ مزار کمیٹی کے ایک رُکن خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لاء کا بیان ہے کہ:

"مجھے خوب یاد ہے کہ نواب زین یار جنگ بہادر شاہی مسجد میں تھے اور چودھری محمد حسین ان کو یہ سمجھا رہے تھے کہ گرد و پیش کی عمارات میں مزار کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔ اس وقت ان کے ہمراہ راجہ حسن اختر میاں امین الدین اور سکندر حیات خاں بھی تھے۔ چودھری صاحب کی زبان پر بار بار آتا تھا کہ مزار کا نقشہ کچھ ایسا ہونا چاہیئے کہ سنگ و خشت کی خاموش زبانیں حقیقت کی ترجمانی کریں اور ان کی ترتیب و تعمیر سے اس حقیقت کا انکشاف ہو کہ اقبال کا کلام اور اس کا پیامِ فقر و سلطنت اور درویشی و شاہی کا ایک حسین امتزاج تھا۔"

اِن توجیہات سے نواب زین یار جنگ بہادر کے دماغ میں تخلیق و ایجاد کی برقی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے وہ تعمیری خاکہ تیار کیا جسے انجام کار قبول خاص و عام کی سند ملی۔

نواب زین یار جنگ جنہوں نے مقبرۂ اقبال کا ڈیزائن تیار کیا تھا، نواب حسن یار جنگ کے ساتھ

عبدالرحمٰن چغتائی، جنہوں نے مرقع چغتائی پر اقبال سے دیباچہ لکھوا کر بے پناہ شہرت حاصل کی تھی اور حیدرآباد میں ان کے اشعار کی تصویری نمائش سے ایک لاکھ روپے سے زائد روپے وصول کئے تھے، یہ بات قطعی پسند نہیں آئی کہ اقبال کے مزار کو حیدرآباد ہی کا کوئی ماہرِ فنِ تعمیر ڈیزائن کرے۔ انہوں نے بڑے سخت الفاظ میں اس ڈیزائن سے بیزارگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے ــــ غالباً اس معاملہ میں وہ پہلے اور آخری شخص ہیں، لکھتے ہیں۔

> ڈاکٹر صاحب کے مقبرے کا ڈیزائن میں نے کیا تھا اور اس خیال سے کیا تھا کہ یہ مختصر سی جگہ جو اقبال کو آرام کے لئے ملی ہے ایک یادگار بن جائے۔ سیاح آئیں تو اپنے دل میں ایک یادگار لے کر جائیں اور وہ ایسی ہو جیسے کسی کامل انسان کی یادگار کو ہونا چاہیئے جس میں تمام انفرادیت کے نشان موجود ہوں۔ یہ ڈیزائن قرطبہ اور اسپین کی طرزِ تعمیر پر کیا تھا اور اس خیال سے بھی کہ مرحوم کو ان ملکوں سے محبت تھی۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن چغتائی صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے کچھ اور آگے نکل کر دہ زین یار جنگ پر ڈیزائن کا معاوضہ حاصل کرنے اور مزار کمیٹی پر کافی روپیہ خرچ کرنے کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکے۔ حالانکہ ڈیزائن کی تیاری اور نواب زین یار جنگ کے تمام اخراجات، حکومت حیدرآباد نے برداشت کئے تھے۔ چغتائی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

> "اقبال مقبرہ کمیٹی نے ایک ڈیزائن بنایا ہے، اس کی اُجرت ادا کرنے کے علاوہ اس کے بلاک بنانے پر بھی کافی روپیہ خرچ کیا ہے۔ اس کے چھپے ہوئے پرنٹ مطالعے کے لئے مل سکتے ہیں۔ جب اس ڈیزائن پر کچھ لوگوں نے اعتراضات کئے اور ان لوگوں کے سامنے ہے جنہوں

نے اقبال کی خود داری کا قلعہ استوار کیا تھا تو ان کی اس شعریت پر اور فلسفہ کو ٹھیس لگی جو انہوں نے اقبال کے مزار کا ڈیزائن قیمت دیکر کروایا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ڈیزائن اس ملک کو بھیج دیا گیا ہے جہاں کے وزیر اعظم کا چیک ایک غیر فانی نظم لکھ کر واپس کر دیا گیا تھا اور فیصلہ کیا گیا تھا کہ اقبال کی خود داری کا حشر دفتری رعنائیوں اور افرونیت کا شہکار نہ بنے گا۔"

چغتائی صاحب نے آخر میں کہا ہے۔

"یہ ہیں بیسوی صدی کے لوگوں کے کارہائے نمایاں اور زندہ مثالیں جنہوں نے خودکشی اقبال کے نام پر کرنی ہے"۔

ریاست حیدرآباد سے بے شمار لوگوں کو مدد دی جاتی تھی، لیکن اس کو اس قدر خفیہ رکھا جاتا تھا کہ عام لوگ، اس سے بے خبر رہتے تھے۔ یہ تو ایک سرکاری تجویز تھی جو مانک راو ڈھل کے ہاتھ لگ گئی تھی جسے اس نے نقل کر دیا ہے ورنہ ایسی کتنی تجویزیں ہوگی جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اس تجویز کے عام ہوتے ہی شدھی سنگھٹن اور آریہ سماجی تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ بعض افراد نے حیدرآبادی مسلمانوں کے خلاف زبردست مہم چلائی اور نظام دکن پر الزام لگایا کہ وہ اقبال جیسے فرقہ پرست شاعر اور اس کے اہل خاندان کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی مطالبہ کیا جانے لگا کہ سر رابندر ناتھ ٹیگور کو شانتی نکیتن جیسا ادارہ قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔

اس کے چند دنوں بعد نواب حسن یار جنگ یورپ سے واپس ہوئے تو ان کو اپنے بعض جاگیری علاقوں کی کارآموزی پر مامور کیا گیا۔ وہ چار یا پانچ سال

حیدر آباد سے باہر رہے۔ لیکن اِن چار پانچ سالوں میں بھی ان کے اوقات کا بڑا حصّہ اقبال کی شاعری اور پیغام کو عام کرنے میں گذرا۔

رفقائے اقبال کی امداد

یہ زمانہ انتہائی مقبولیت کا تھا۔ پورے اسلامی ہند کی توجہ ان کے افکار و خیالات کی جانب مبذول ہو گئی تھی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر پنجاب میں زمیندار پارٹی، لکھنؤ میں کانگریس دہلی میں آریہ سماج اور اسی قسم کی دوسری تحریکوں نے ان کے خلاف زبردست محاذ قائم کر دیا تھا اس لحاظ سے نہ صرف حیدر آباد ہی میں اقبال کے افکار و خیالات کی نشوونما ہو سکتی تھی اور وہی ان کے پیغام کو عام کر سکتا تھا اسی احساس کے پیشِ نظر، ان کے فلسفہ اور نظریہ کو عام کرنے کے لئے ایک دو نہیں کئی نوجوان آگے بڑھے۔ یہی نہیں بلکہ بعض نے حکومت پر زور دیا کہ وہ اقبال اور ان کے اہل خاندان کی سرپرستی کرے تاکہ وہ غم روزگار سے آزاد ہو کر اسلامیانِ ہند کی خدمت کر سکیں۔ یہ بات بعض فرقہ پرستوں اور کانگریس نوازوں کے مفاد کے خلاف تھی۔ ہر ممکن طریقے پر سدِّ راہ بننے کی کوشش کی، اس کے باوجود نظام دکن، نے اقبال کے بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال کی تعلیمات و تربیت کے تمام اخراجات اپنے ذمہ لے لئے اور خطیر رقم بطور امداد دی اس واقع کی تفصیل حیدر آباد کے ایک مؤرخ مانک راؤ وٹھل نے اپنی آٹھ جلدوں پر مشتمل بوستان آصفی میں درج کی ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

> "۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے فرزند آفتاب اقبال کو جو کہ سرکار عالی سے ایک سو پونڈ قرض حسنہ بغرض تعلیم منظور کیا گیا تھا وہ اب ان کی مالی مشکلات کے مدِ نظر معاف کر دیا جا کر بہ مد اعانت امداد

محسوب کیا گیا ہے۔[1]

حسن یار جنگ حیدر آباد میں

سیاسی اعتبار سے یہ پُر آشوب دور نواب حسن یار جنگ نے اورنگ آباد ہی میں گذارا۔ ۲۱ اپریل ۳۸ء کو جب آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر سُنائی کہ مشہور و معروف فلسفی شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کا آج صبح ۶۱ برس کی عمر میں ان کی قیام گاہ واقع میو روڈ لاہور پر انتقال ہو گیا تو اورنگ آباد کے اہلِ علم طبقے میں غم کی لہر دوڑ گئی شہریوں نے سارا بازار بند کر دیا۔ اسکولوں اور کالجوں پر تالے لگا دیئے گئے۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد اور دوسرے علمی اور ادبی اداروں پر عزاخانوں کا گمان گذرنے لگا۔ اس وقت بابائے اُردو مولوی عبدالحق اورنگ آباد میں عالمگیر کی چہیتی بیگم دل رس بانو کے مقبرہ میں رہتے تھے اور یہیں سے ان کا سہ ماہی اُردو بھی جاری ہوتا تھا۔ ان کی اقبال سے طویل ملاقاتیں رہی تھیں اور ایک عرصہ تک خط و کتابت کا بھی سلسلہ رہا تھا۔ اس بنا پر نواب حسن یار جنگ کا خیال تھا کہ وہی اقبال کے یوم تعزیت کے پروگرام کا اعلان کریں گے۔ جب اس سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو نے کسی قسم کا اعلان نہیں کیا تو نواب حسن یار جنگ نے انجمن ترقی اُردو کے دفتر پہونچ کر بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے ملاقات کرنا چاہی تو بتایا گیا وہ کسی کام سے حیدر آباد چلے گئے ہیں۔ انہوں نے انجمن ترقی اُردو کے عملے کے بعض ارکان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اقبال کی یاد میں تعزیتی جلسہ منعقد کریں۔ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں رائیگاں ہوئیں تو اُنہوں نے خود شہر کے ایک بہت

[1] بستانِ آصفیہ جلد ششم

سینما گھر میں جو ایک ہندو کی ملکیت تھا اقبال کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا۔ یہ جلسہ کسی ادارے یا انجمن کی طرف سے نہیں بلکہ نواب حسن یار جنگ کی ذاتی کوششوں سے ہوا تھا جس کی صدارت خود نواب صاحب ہی نے کی تھی۔ اس میں مقامی ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد نے اقبال کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا میجر آفتاب حسن، پروفیسر امیر احمد امیر، سید احمد ندوی اور غلام طیب نے مقالے پڑھے۔ میر تذر علی درد کاکوروی، عبدالرب کوکب اور سکندر علی وجد نے اپنی نظمیں سنائیں۔

اورنگ آباد ایک پُرفضا اور خوبصورت شہر ہونے کے باوجود آبادی کے لحاظ سے زیادہ بڑا نہیں تھا وہاں سے کوئی اخبار نکلتا تھا نہ ادبی جریدے شائع ہوتے تھے۔ ابلاغ عامہ کے ذریعوں کا فقدان تھا۔ اس لئے اس جلسہ کی کارروائی اخباروں میں جگہ پا سکی نہ اورنگ آباد کے باہر اس کا کسی کو علم ہو سکا اس کے باوجود آج بھی ایسے لوگ ہم میں موجود ہیں جو اس جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال سناتے ہیں۔

اقبال کی رحلت کے چند ماہ بعد تک نواب حسن یار جنگ نے اورنگ آباد میں قیام کیا اور اس دوران وہاں عوام میں اقبال سے دلچسپی پیدا کی اور مولوی عبدالحق کو کسی نہ کسی طرح اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے رسالہ اُردو کا اقبال نمبر شائع کریں چنانچہ ان ہی کی خواہش پر بہت سے لوگوں نے مولوی عبدالحق کو اقبال کے سلسلہ میں اپنے تاثرات اور پیغامات بھیجے۔

۱۹۳۹ء کے آخر میں نواب حسن یار جنگ حیدرآباد چلے آئے۔ حیدرآباد میں مسلمان جس سیاسی کشمکش سے دوچار تھے اس کی وضاحت پہلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ نواب حسن یار جنگ نے سیاست میں حصّہ لینا چاہا لیکن خانوادہ شاہی کا رکن ہونے

کی وجہ سے ان کو سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی ممانعت کر دی گئی ۔ اور اس سلسلہ میں انگریز کے در پردہ زور دینے پر نظام دکن ایسا فرمان جاری کرنے پر مجبور ہو گئے جس میں نواب حسن یار جنگ کو اس امر کے لئے پابند کر دیا گیا کہ وہ کسی بھی سیاسی سرگرمی میں حصّہ نہ لیں۔

اس کے بعد نواب حسن یار جنگ نے اپنی تمام دلچسپیاں اقبال اور ان کے پیغام کی طرف مرکوز کر دیں اور بزمِ اقبال کے ذریعہ اقبال کے کلام و پیام کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔

بزمِ اقبال نے اپنے فنڈ سے بیشتر ضرورتمندوں، ادیبوں، شاعروں اور اسکالروں کی بھی مدد کی۔ مثال کے طور پر جب بنگالی کے مشہور شاعر قاضی نذرالاسلام بیمار تھے اور انکے پاس علاج کے لئے روپیہ نہیں تھا تو یہ صرف بزم اقبال تھی جس نے اس مشکل وقت میں نہ صرف ان کو مالی امداد دی بلکہ انکے خصوصی علاج کا بھی انتظام کیا۔ بزم اقبال کے عہدیداروں نے اسی طرح کے دوسرے رفاہی کام بھی اپنے فرائض میں شامل کر لئے تھے جس کی وجہ سے ہندوستان اور اسکے باہر بھی اسکی عظمت اور مرتبہ میں اضافہ ہو گیا تھا

بزم اقبال کی کارکردگی کی رپورٹیں کئی سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا تفصیلی احاطہ ممکن نہیں۔ یہ بارہ سال کی علمی اور ادبی تاریخ اقبالیات کے سلسلہ میں بہت ہی اہم معلومات کا باعث ہو سکتی تھی لیکن حیدر آباد، مسلمانوں کی تہذیب و تمدّن کا حیدر آباد، اقبال کے شعر و نظم کا حیدر آباد اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ۱۳ ستمبر ۴۸ء کی رات کو ہمیشہ کے لئے سو گیا لیکن بزمِ اقبال کے بانی اور صدر نواب حسن یار جنگ کے بارے میں عبدالرحمٰن چغتائی کے یہ الفاظ آج بھی زندہ اور روشن ہیں۔

"آپ تو ڈاکٹر اقبال صاحب کے دیرینہ عقیدت مند ہیں
جنہوں نے اقبال ڈے کی بنیاد رکھی"۔

25.8.69

M. A. REHMAN CHUGHTAI

مکرمی مخلصی نواب حسن یار جنگ صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا گرامی نامہ ۲۰ اگست کا پایا تو بہت بہت شکریہ
افسوس سے عرض کرنا پڑتا ہے کہ آپ کے والا نامہ کا جواب جلد از جلد نہ دیا جا سکا
جس کا سبب عدم موجودگی تھی۔ آپ کا نوازش نامہ باعث شکریہ ہے۔ عرض ہے کہ کراچی میں
یہاں تو اس کی پبلسٹی کئی بار ہو چکی ہے۔ جب کتاب مرقع شائع ہوئی تھی اور صدر صاحب نے اس کا
افتتاح کیا تھا تو ڈان پاکستان ٹائمز کے علاوہ کراچی کے اردو انگریزی اخبارات نے بھی اس کا تذکرہ
بڑے اچھے انداز میں اور خوشی کی حالت میں کیا تھا اور اس خدمت کو اس صدی کی
بہترین تخلیق قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ مجلس اقبال نے بہت اچھی اور بہت محققانہ انداز کی
چھپائی اس کے علاوہ ماہ نو۔ اردو انگریزی پاکستان کوارٹرلی۔ میں اور گورنمنٹ اور دیگر مع
اخبار اور رسالوں میں بہت کچھ چھپ چکا ہے۔ ہو سکتا ہے اتفاق سے آپ کی نظر سے
کوئی چیز نہ گزری ہو۔ میرے بھائی صاحب دوبارہ کراچی آ رہے ہیں۔ امید ہے آپ
سے دوبارہ ملاقات کریں گے۔ اور وہ کتابیں بھی آپ کو ساتھ لے کر آئیں گے۔ مگر آپ کو
یہ کتاب ضرور تو بھی پاس رکھنی چاہئے۔ آپ تو ڈاکٹر اقبال کے دیرینہ عقیدت
مند ہیں اور آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اقبال ڈے کی بنیاد رکھی۔ آپ کے یہاں تو ہونا
ضرور ہی چاہئے اور آپ کی لائبریری کی زینت ہونا چاہئے۔ یہ ایڈیشن محدود تعداد
میں شائع کیا گیا ہے دوبارہ ایسا ایڈیشن کبھی شائع نہیں کیا جائے گا۔ آج اس کی قیمت جو کچھ بھی ہے
کل اس سے چار گنا ہو جائے گی۔

مرقع چغتائی کا خاص ایڈیشن ۲ ہزار روپے میں مل سکتا ہے۔ یہ ایڈیشن
بھی کبھی نایاب ہو جائے گا۔

امید ہے آپ کے اہل و عیال بخیریت سے ہوں گے۔

آپ جیسا پایا تو بہت ہی نیک۔ آپ کی محبت اور خلوص کو بہت دعا دیں۔

فقط والسلام

مخلص چغتائی

عبدالرحمٰن چغتائی کا خط حسن یار جنگ کے نام

تیسرا باب

بزم اقبال کا قیام

حیدرآباد کے اہلِ علم کو مسلم کلچرل سوسائٹی سے توقع تھی کہ جس طرح اُس نے اقبال کی زندگی میں ان کا جشن منایا تھا اسی طرح ان کی وفات کے بعد بھی ان کے نصب العین کو عام کرنے کی کوشش کرے گی لیکن اس کے عہدہ دار اس سلسلہ میں کچھ کام کرنے کی بجائے خاموش ہو گئے تو اصغر حسین دوم تعلقہ دار نے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی خلیفہ عبدالحکیم، فخر الدین حسن، مصلح الدین اور دوسرے صاحبانِ علم کے سامنے بزمِ اقبال کے قیام کی تجویز رکھی اور کیقباد جنگ کو اس کا صدر بنایا جو رومی و اقبال کے افکار سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ نومبر ۳۸ء میں اس بزم کا دفتر کتب خانہ آصفیہ کی بیرونی عمارت میں قائم کیا گیا جہاں ہفتہ وار اجتماعات میں اقبال اور ان کے فن کے بارے میں مضامین اور مقالے پڑھے جانے لگے۔

اسی کے کچھ دنوں بعد ۳۹ء میں بہادر یار جنگ نے انجمن اتحاد المسلمین کی صدارت سنبھالی اور اس کو اس قدر متحرک اور فعال کر دیا کہ تمام مسلمانوں کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اسی زمانے میں سر اکبر حیدری نے بعض ایسی تقریریں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت اس آئین کو بدلنا چاہتی ہے جو صدیوں سے اس ریاست میں جاری ہے۔ ان تقریروں سے سیاسی آویزشوں کا ذخیرہ کھُل گیا کانگریس اور ہندو سبھا کے لیڈر حیدرآباد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مقامی ہندو لیڈروں نے بھی وارد ھا کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ مہاسبھائیوں نے جابرانہ انداز میں اور کانگریس نے قومیت کے اصول پر ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔ فرقہ پرستی کی آگ زہر بن کر رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اندرونِ ریاست

اور بیرونِ ریاست مسلمانوں اور سلاطین آصفیہ کے خلاف زہر اگلا جانے لگا۔ ساتھ ہی ستیہ گرہ بھی شروع ہوگئی۔ مسلمانوں کے مارے جانے کے واقعات بھی عام ہوگئے۔ ان نامساعد حالات میں بہادر یار جنگ نے ایک طرف تو مسلمانوں کی صف بندی کی اور دوسری طرف اقبال کے آتشیں افکار سے ان کا لہو گرمایا۔

نواب بہادر یار جنگ کو خوب معلوم تھا کہ حیدرآباد کے مسلمان جاگیرداروں کے زیر اثر ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ بیشتر جاگیرداروں کو لہو ولعب اور عیش وعشرت نے اپنی حقیقی ذمہ داریوں سے غافل کر دیا ہے اس لئے ان کی نگاہ بار بار امرائے پائے گاہ کی جانب اٹھی تھی جو ملک وقوم کے بارے میں مخلص ہونے کے ساتھ اپنے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے۔

اسی خاندان کے ایک امیر نواب حسن یار جنگ سے بہادر یار جنگ کی دوستی تھی نظام کالج اسکول میں ۱۹۰۸ء میں کچھ عرصہ حسن یار جنگ اور بہادر یار جنگ ہم جماعت بھی رہ چکے تھے۔ بہادر یار جنگ حسن یار جنگ سے حیدرآباد کے ملکی اور سیاسی معاملات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے انہوں نے نواب حسن یار جنگ سے خواہش کی کہ وہ بھی حیدرآباد کو انگریزوں اور کانگریس کے اثر ونفوذ سے نجات دلانے کے لئے ان کے ساتھ سیاسی میدان میں آئیں۔ ابھی نواب حسن یار جنگ نے سیاسی میدان میں آنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ انگریزوں نے نظام دکن کے ذریعہ خانوادہ شاہی سے تعلق رکھنے والے امرا پر پابندی لگادی اور کہا کہ ان کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ نواب حسن یار جنگ نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے۔

"نواب بہادر یار جنگ سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ جب میں ۳۹ء کے آخر میں اورنگ آباد اور وزنگل کی ٹریننگ ختم کر کے

حیدرآباد آگیا تو بہادر یار جنگ نے جو میرے سیاسی خیالات سے واقف تھے کئی بار مجھ سے خواہش کی کہ میں بھی سیاسی میدان میں آکر ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں نظامِ دکن کے فرمانِ امتناعی کی موجودگی میں سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بہادر یار جنگ سے اس سلسلہ میں تبادلۂ خیال کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں کسی علمی ادارے کے توسط سے اپنے ملک کے عوام کی خدمت کروں گا۔

حسن یار جنگ اور بزمِ اقبال

اس وقت بزمِ اقبال قطعی غیر موثر تھی۔ اس کا دفتر چند لکھنے والوں کے باہمی مل بیٹھنے کی جگہ بن کر رہ گیا تھا چونکہ بزم اقبال کے ذریعہ ملک اور قوم کی بہترین طریقہ پر خدمت کی جاسکتی تھی اور اقبال کی شاعری کے پس منظر میں مسلمانوں کو ان کے تہذیبی، مذہبی اور سماجی نصب العین سے آگاہ کیا جاسکتا تھا۔ اسے نواب حسن یار جنگ نے اپنی صلاحیتوں کی جولاں گاہ بنایا اور مایوسی اور نا اُمیدی کی گھری ہوئی تاریکیوں میں تنظیم و یقین کی مشعل روشن کی۔ اقبال نوجوانوں کا شاعر تھا۔ اس کی تمام شاعری نوجوانوں کے لئے تھی۔ نواب حسن یار جنگ نوجوان تھے پہلے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اور پھر انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ ملک کے لئے کام کرنے کا حوصلہ تھا۔ قوم کو کامرانیوں سے ہمکنار کرنے کی اُمنگ تھی۔ وہ آگے بڑھے تو نوجوانوں کا ایک پورا گروہ ان کے ساتھ ہو گیا۔ جو اقبال اور اس کی شاعری کا والہ و شیدا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں نواب حسن یار جنگ نے بزمِ اقبال کی صدارت سنبھالی۔ اس کے پرانے طریق کار کو تبدیل کیا اور اسے ایک ایسے ادارے کی شکل دے دی جس کو حیدرآباد اور بیرونِ حیدرآباد کے تمام ممتاز

اسکالروں کا تعاون حاصل تھا جس کی سرگرمیوں کی خبریں ریاستی حدود سے باہر نکل چکی تھیں۔

قائداعظم اور بزمِ اقبال

چنانچہ جب ۱۹۴۱ء میں قائداعظم حیدرآباد آئے تو نواب بہادر یار جنگ نے ان سے بزم اقبال اور اس کے مقاصد کا ذکر کیا۔ قائداعظم کے نزدیک اقبال سے زیادہ کوئی محبوب شخصیت نہیں تھی۔ انہوں نے بزمِ اقبال کے قیام پر بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

نواب حسن یار جنگ بیان کرتے ہیں۔

"قائداعظم سے میری دوسری ملاقات ۱۹۴۱ء میں بہادر یار جنگ کے دولت کدہ بیت الامت پر ہوئی۔ بہادر یار جنگ نے قائداعظم سے میرا تعارف کرایا اور حیدرآباد میں بزمِ اقبال کے قیام اور میری صدارت کے بارے میں گفتگو کی۔ قائداعظم نے میری کوششوں کو پسند فرمایا اور کہا کہ بزم اقبال کے ذریعے ملک کے مسلمانوں کو سیاسی اور مذہبی طور پر پوری طرح بیدار کیا جا سکتا ہے۔ جب قائداعظم سے بزمِ اقبال کے دفتر کے معائنہ کی درخواست کی گئی تو انہوں نے یقین دلایا کہ جب وہ دوبارہ حیدرآباد آئیں گے تو اس بزم کے دفتر کا معائنہ کریں گے۔"

لکھنؤ کا ادارۂ اقبال

قائداعظم کا بزمِ اقبال کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد پر گفتگو کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بیشتر اخباروں نے اپنی خبروں میں اس واقعہ کے لئے بھی جگہ نکالی۔ اس کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے مسلم لیگی کارکنوں نے بھی

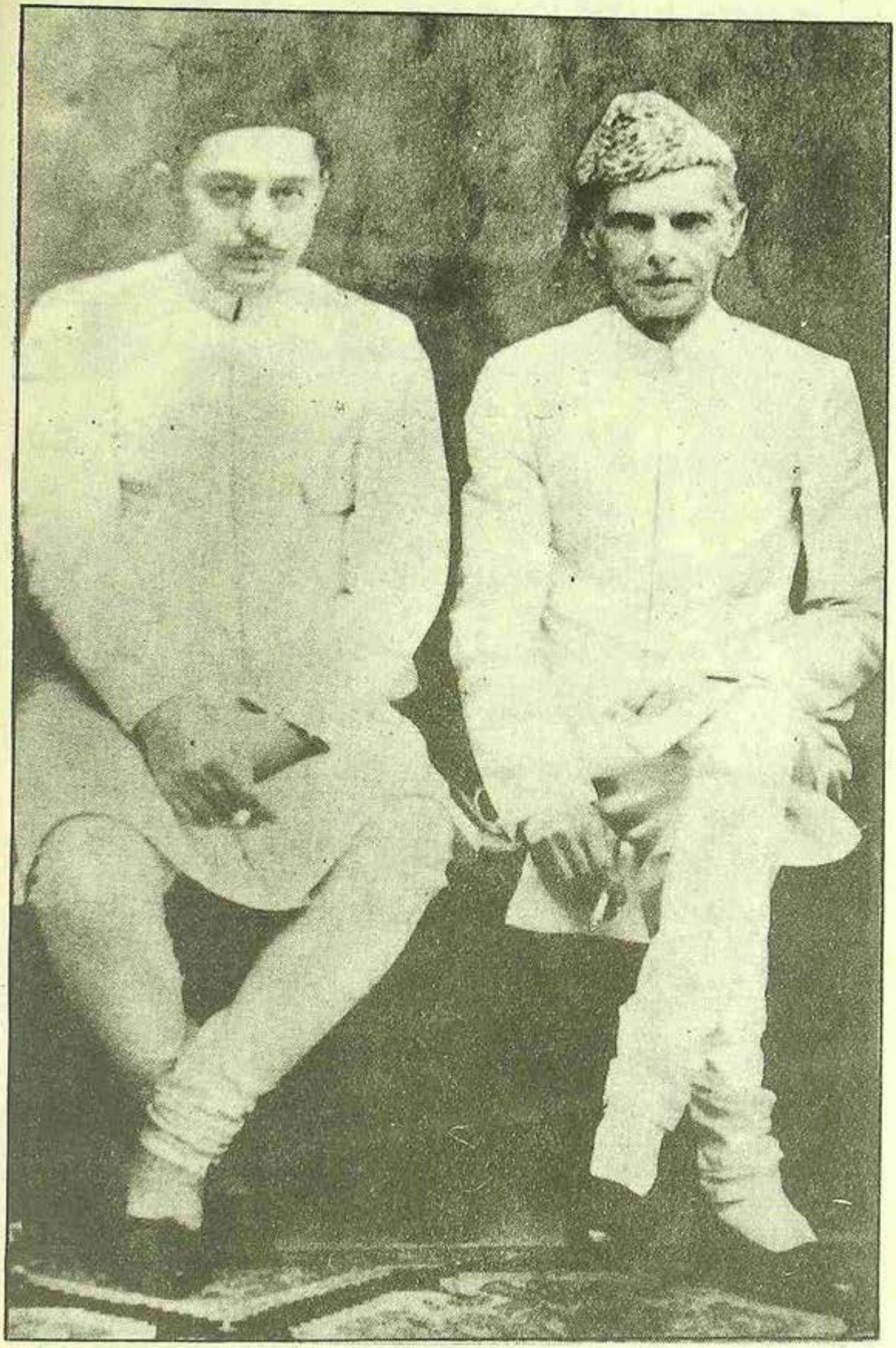

۱۹۴۶ء میں قائداعظم محمد علی جناح مرکزی بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ کے ہمراہ

۱۹۴۶ء میں قائداعظم محمد علی جناح مرکزی بزم اقبال کے دفتر کے معائنہ کے بعد اس کی کتاب الرائے پر اپنے خیالات تحریر کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بزم کے صدر نواب حسن یار جنگ اور نائب معتمد معین الدین کولاسی کھڑے ہوئے ہیں۔

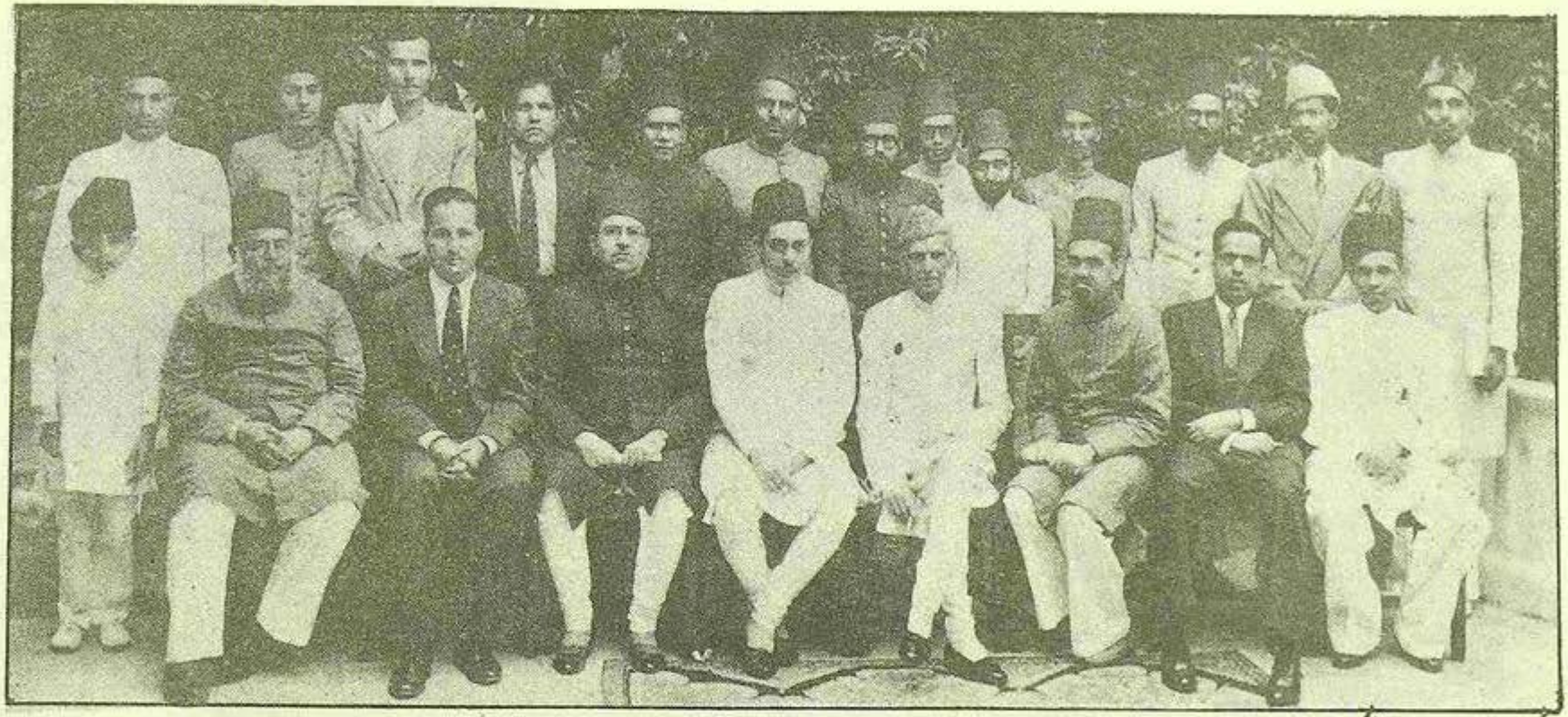

۱۹۴۶ء میں قائداعظم محمد علی جناح کو مرکزی بزم اقبال حیدرآباد کی جانب سے کیسۂ زر پیش کیا گیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں دائیں سے بائیں (بیٹھے ہوئے) قائداعظم، مظہر الدین اکاؤنٹینٹ جنرل، مظہر علی کامل، قائداعظم محمد علی جناح، نواب حسن یار جنگ، نواب دوست محمد خاں، عبدالقیوم خاں اور خواجہ محمد احمد نظر آرہے ہیں جب کہ ایستادہ افراد میں یامین زبیری، سید محمود علی ہاشمی، پروفیسر غلام دستگیر رشید، اکبر وفاقانی، پروفیسر حسن الاعظمی، اور سرمست آزاد شامل ہیں۔

اقبال کے کلام اور پیام سے دلچسپی لینی شروع کردی چنانچہ لکھنؤ کے شہری مسلم لیگ کے صدر عبدالوحید خاں نے لکھنؤ میں ادارۂ اقبال قائم کیا اور بزمِ اقبال کی معرفت نواب بہادر یار جنگ کو اس کے افتتاح کی دعوت دی۔ عبدالوحید خاں لکھتے ہیں۔

"میں نے لکھنؤ میں ادارۂ اقبال قائم کیا تھا جس کا مقصد علامہ اقبال کی تعلیمات کو مقبول بنانا اور ان کی شاعری کو عوام تک پہونچانا تھا جو ایک نئی اور غیر معمولی بات تھی۔ انیس اور دبیر کے شہر میں جس کا ہمیشہ نعرہ انا ولا غیری رہا۔ اقبال کو بحیثیت شاعر تسلیم کرنا کفر سمجھتا تھا۔ بال جبریل اور ضربِ کلیم کی اشاعت کے بعد کچھ عرصہ تک اودھ پنچ سے کارٹونوں کے ساتھ اقبال کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ لکھنؤ کے ادیب شعرا رسوائے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے اقبال کو ایک مفکر اور بلند پایہ فلسفی تو مانتے تھے مگر زبان داں شاعر کی حیثیت سے کوئی درجہ نہیں دیتے تھے، میں نے نواب صاحب سے ذکر کیا، آپ کو علامہ سے بے حد شغف ہے بلکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے خیالات کی روانی اقبال کی مرہونِ منّت ہے۔ آپ میری مدد فرمائیں"۔ آنجہانی سپرو کا بھی یہی مشورہ تھا۔ میری خواہش تھی کہ مسلم لیگ کی طرف سے نواب صاحب کا استقبال ہو! لیکن آپ نے منع فرمادیا اور کہا میں صرف ادارۂ اقبال کی دعوت پر لکھنؤ آیا ہوں اور اسی ادارے کے پلیٹ فارم پر تقریر کروں گا۔ گنگا رام میموریل ہال میں جلسہ ہوا۔ سلیمان ندوی عبدالماجد دریا آبادی، حسرت موہانی، ساغر نظامی کے علاوہ یوپی کے ہر جگہ کے ادیب اور علم دوست حضرات خاص طور پر شریک

ہوئے۔ عام حاضرین کی عجیب کیفیت تھی۔ لکھنؤ میں اس دن سے پیشتر کبھی ایسی تقریر ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد کبھی ہو سکی۔"

نواب بہادر یار جنگ کی اس افتتاحی تقریر نے لکھنؤ ہی نہیں پورے ہندوستان میں بزمِ اقبال کی دھاک بٹھادی اور لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہندوستان میں حیدر آباد ہی ایک ایسی ریاست ہے جہاں اقبال کو بہتر طریقے پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی سال بزمِ اقبال کا دستور مرتب کیا گیا تاکہ بزمِ اقبال نہایت واضح طور پر بھرپور طریقے سے کام کر سکے۔ یہ دستور اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کی اساس پر آج بھی اقبال کے کلام و پیام کو چند پڑھے لکھے لوگوں کے حلقوں سے نکال کر عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی ضرورت اور افادیت کے پیشِ نظر ہم اسکے بعض مندرجات نقل کر رہے ہیں۔

بزمِ اقبال کا دستور

اسی سال بزمِ اقبال نے اپنا ایک دستور مرتب کیا اور اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔ دستور میں اغراض و مقاصد کے عنوان سے بتایا گیا کہ اقبال کی شاعری، فلسفہ اور تصورِ حیات کے متعلق بحث و تحقیق کی جائے گی۔ تقریر و تحریر کے ذریعے ان کے پیام کو عوام تک پہنچایا جائے گا۔ غیر اُردو داں لوگوں میں ترجمے کے ذریعے، اقبالیات کی اشاعت کی جائے گی۔ بلا امتیاز مذہب و ملت مختلف مکاتیبِ خیال سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ذہنی تعلق پیدا کیا جائے گا تاکہ ہر نظریہ سے اقبال کے فن و شخصیت پر غور ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی اقبال کے کلام و پیام پر بحث و تمحیص کے لئے ملک میں مختلف مقامات پر حلقہ ہائے مطالعہ قائم کئے جائیں گے۔ درسِ اقبال کا بھی اہتمام کیا جائے گا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اقبال کی شاعری

سے استفادہ کرسکیں۔ بزم کے کارکنوں میں اقبال کے کلام کو سمجھنے اور اس کے نظریۂ شاعری پر تقریر و تحریر کی صلاحیت پیدا کی جائے گی۔ تحقیق و تدریس کے لئے عصری کتب خانے قائم کئے جائیں گے ان میں اقبال اور متعلقات اقبال کے بارے میں تمام کتابیں رکھی جائیں گی۔ شہر کے مختلف مقامات پر دار المطالعوں کا قیام عمل میں آئے گا۔ اقبال سے متعلق مضامین، رسالے اور جریدے جمع کئے جائیں گے۔

یادگار اقبال کے نام سے حیدرآباد میں ایک مستقل یادگار قائم کی جائے گی جس میں ایک پبلک ہال اور دار المطالعہ ہوگا جس میں علامہ کے مکتوب اور تصانیف کے علاوہ جدید، قدیم خطاطی کے نمونے، کتبے، طغرے اور تصاویر فراہم کی جائیں گی۔ اسی یادگار ہال میں اقبال کے کلام کو مصور کیا جائے گا۔ اس یادگار ہال میں تقریروں، ڈراموں اور فلموں کے ذریعہ اقبال کے کلام کو پیش کیا جائے گا۔ شہر کے تمام محلوں میں بزم کی ذیلی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ توسیعی اور معمولی جلسے کئے جائیں گے۔ جو ملک میں مختلف مقامات پر ہوں گے۔ بیرونی مشاہیر سے اقبال پر کتابیں اور مضامین لکھوائے جائیں گے۔ ہر سال اپریل کے اواخر میں جشنِ اقبال منایا جائے گا۔ اس موقع پر تصویری نمائش بھی کی جائے گی۔ اخبارات و رسائل بھی شائع کئے جائیں گے۔

دستور کے اغراض و مقاصد والے اس حصہ کو پڑھ کر بعض لوگوں کے ذہنوں میں بلاشبہ یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ بزم اقبال کے عہدہ داروں نے اس پر عملدرآمد کیسے کیا؟ ان میں اتنی صلاحیت کہاں سے آگئی، ممکن ہے، بعض ایسے لوگ جو جذبے کی صداقت اور خلوص کی سچائی پر یقین نہیں رکھتے، اسے جھوٹ کا نام دیں اور پروپیگنڈہ کی بھونڈی مثال بتائیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ حیدرآباد کے نوجوانوں کو اقبال سے عشق تھا، محبت تھی، وہ صحیح معنی میں ان کے کلام اور پیغام کے وارث

تھے۔ انہوں نے اپنے جذبوں کی صداقت کو پرکھا، خلوص کی سچائی کو آزمایا اور اقبال کے ایک مکتوب الیہ شاعر، سکندر علی وجد کے قول کے مطابق

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

حسن یار جنگ کی زبانی

بزمِ اقبال کی کارگذاریوں کی تفصیل، مدراس، بمبئی اور حیدرآباد کے مختلف اخباروں کی فائلوں میں دیکھی جاسکتی ہے جو قیام پاکستان کے بعد تک شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ نواب حسن یار جنگ کے ان خطبوں سے بھی، اس بزم کی سرگرمیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو انہوں نے جشنِ اقبال اور یوم اقبال کے موقع پر مختلف برسوں میں پڑھے ہیں۔ وہ ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے ایک خطبہ میں بیان کرتے ہیں۔

"بزم اقبال کا قیام ۱۹۴۱ء کو عمل میں آیا۔ اس کا مقصد اقبال کے کلام اور فلسفہ کی تحقیق اور ریسرچ کرنے اور اس کے کلام و پیام کو صحیح معنوں میں قوم کے رُوبرو پیش کر کے ان کی تشریح کرنا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک اسٹیڈی سرکل قائم ہے جس کی مدد سے پرستارانِ اقبال کو ان کے کلام پر غور و فکر کرنے کی سہولتیں بہم پہونچائی جاتی ہیں اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے طلبا اپنے مقالوں کی تیاری میں تحقیق کر کے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ بزم کی جانب سے معظم بلڈنگ میں ایک دارالمطالعہ قائم ہے۔ اقبال کے متعلق جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں تقریباً ان سب کو فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے اخبارات

اور رسائل میں اقبال اور ان کے کلام پر جتنے مضامین اور مقالے شائع ہوتے ہیں ان سب کو اکٹھا کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد جہاں جہاں یوم اقبال منائے گئے۔ ان سب کا ریکارڈ بھی جمع کیا گیا ہے اور یہ کام مسلسل جاری ہے۔ چنانچہ ان کتابوں کی نمائش کے لئے جو انتظام کیا جا رہا ہے۔ ان میں ان سب چیزوں کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔

بزم کی جانب سے ماہانہ جلسے منعقد کئے جاتے ہیں جن میں ملک و بیرونِ ملک کے قابل افراد اقبال کے کلام اور فلسفہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ جن میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کے علاوہ سر عبدالقادر سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، مولانا حسن سہروردی وغیرہ کئی مرتبہ تقریریں کر چکے ہیں۔ انگلستان کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر آسوالڈ عبداللہ نے بھی ایک بصیرت افروز تقریر کی تھی۔

بزمِ اقبال کی جانب سے ہر سال نہایت کامیابی کے ساتھ، دارالسلطنت ممالک محروسہ سرکار عالی میں یوم اقبال منایا جاتا ہے اور ملک کے ممتاز اشخاص ان جلسوں کی کامیابی کے لئے حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان جلسوں میں جن قابل احترام ہستیوں نے پیغامات ارسال کئے ان میں ہز ہائی نس والاشان اعظم جاہ، سر رابندر ناتھ ٹیگور، سر تیج بہادر سپرو، محمد علی جناح، خواجہ حسن نظامی سر اکبر حیدری اور نواب بھوپال وغیرہ شامل ہیں"۔

یہ تھی بزم اقبال کی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک کی کارکردگی کی رپورٹ جس سے یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں کہ بزم نے دو سال کے مختصر سے عرصہ میں کتنی تیزی کے

ساتھ اقبال کے کلام اور پیام کو عوام تک پہونچایا اور ملک کے متعدد لکھنے والوں میں اقبال کے ذہنی اور فکری مطالعہ کی لگن اور تڑپ پیدا کی۔

اس کے تین سال بعد ۱۹۴۶ء میں بزم اقبال کے شریک معتمد معین الدین کولاس نے اپنی رپورٹ میں بزم اقبال کی سالانہ کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا:

کولاس کا بیان

"حیدرآباد کے اکثر اضلاع، تعلقات اور ہندوستان کے بیشتر مقامات کے علاوہ لندن، مصر اور افریقہ میں بھی بزم اقبال کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ مجلس اصطلاحات اقبال کا کام بھی قریب الختم ہے۔ یہ مجلس اقبال کے کلام اور تصانیف سے مشکل الفاظ اور تلمیحات کی وضاحت کا کام انجام دے رہی ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسین، شاہد حسین رزاقی، یوسف ناظم، غلام دستگیر رشید نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ اقبال میموریل فنڈ میں بھی خطیر رقم جمع ہو چکی ہے۔ اقبال ہال کی تعمیر کا کام بھی شروع کیا جا رہا ہے۔ مرقع اقبال کی تیاری کا بھی کام شروع کر دیا گیا ہے چند تصاویر کے بلاک بھی تیار کر لئے گئے ہیں۔ درس اقبال کو عام کرنے کے لئے مدراس کے طلبار کے لئے بھی نصاب مرتب کیا جا رہا ہے۔

مس فرگوسن اور سر عبدالقادر کی خواہش پر بزم نے لندن میں بھی اقبال میموریل ہال قائم کیا ہے اور اس کے لئے ۷۵ پونڈ کی رقم بھجوائی ہے۔ وہاں کے اسلامک سینٹر میں اقبال میموریل لائبریری کا قیام بھی عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ڈربن میں بھی اقبال اسٹڈی گروپ پیام اقبال کی نشر و اشاعت کا کام بخوبی انجام دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ بمبئی، کلکتہ، برار، امراوتی، بنگلور، کرنول، علیگڑھ اور الہ آباد میں بھی بزم کی شاخیں قائم کر دی گئی ہیں۔

چوتھا باب

اقبال حلقۂ امراء میں

نواب حسن یار جنگ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے محض اپنی ذاتی کوششوں سے اقبال کو ایسے طبقہ میں بھی مقبول بنایا جو کاخ امراء کے در و دیوار گرانے کا قائل نہیں تھا۔ جب اس طبقہ نے اقبال کے کلام اور پیام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو اس کو داغ اور امیر کی شاعری زندگی کے عصری تقاضوں سے عاری معلوم ہونے لگی۔ وہ اپنی بے سوز خواب گاہوں اور بے رنگ شبستانوں سے نکل کر حقائق کے حیات آفریں اور جاں بخش اجالوں میں نکل آیا۔ چنانچہ جب حسن یار جنگ بہادر نے نواب بسالت جاہ بہادر سے یومِ اقبال کے افتتاح کی درخواست کی تو اسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا اور اپنے عمل سے یہ بات ثابت کر دی کہ عوام ہی نہیں بلکہ خانوادۂ شاہی کے تمام افراد اقبال سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ جب ۲۱ اپریل ۴۳ء کی صبح کو نواب بسالت جاہ یومِ اقبال کے افتتاح کے لئے زمرد محل پہنچے تو بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ، نائب صدر مولوی فخر الدین حسن اور معتمد معین الدین کو اس نے ان کے استقبال کی عزت حاصل کی اور پھر ہزاروں لوگوں نے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ آج خاندان شاہی کا ایک فرد اپنی تمام عیش سامانیوں کو چھوڑ کر فرنگی مدنیت کے سب سے بڑے دشمن شاعر اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کے درمیان موجود ہے۔ مولوی احمد عبد اللہ المدودی نے پہلے سے لکھی ہوئی اپنی خیر مقدمی تقریر پڑھی۔

بسالت جاہ کی تقریر

اس کے بعد نواب بسالت جاہ نے خانوادہ شاہی کے مخصوص انداز میں اس یوم کا افتتاح کرتے ہوئے کہا:

"میرے لئے یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ آج حیدرآباد میں اس عظیم شاعر کی یاد منائی جارہی ہے جو کل تک ہمارے ساتھ تھا جب اندرادب کے بعض بہی خواہ داغ کی موت کو اردو شاعری کی موت سے تعبیر کررہے تھے اور ان کے خیال میں داغ کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا شاعر نہیں رہا تھا۔ اقبال نے اس کے عروق مردہ میں جان ڈالی اور اسے نئے سرے سے زندہ کیا۔

دنیا اقبال کو شاعر، فلسفی، سیاستداں اور قانون داں کہتی ہے میں اس سے بڑھ کر "پوائنٹ آف ایج" کہوں گا۔ اس نے نہ صرف مشرق و مغرب کے فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا بلکہ روحانی اور مادی کشمکش بھی دیکھی تھی۔ وہ دنیائے اسلام کی ضرورتوں اور مسائل کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ اپنی قوم سے مخاطب ہے۔ اس کو بے حسی کے دلدل سے نکالنا چاہتا ہے اس کا پیام عمل انگریزی شاعر براؤننگ سے ملتا جلتا ہے وہ بھی اپنی قوم کو بے حسی سے نکالنا چاہتا تھا البتہ اس میں اور اقبال میں یہ فرق ہے کہ وہ مطلوب و مقصود کے حسن و قبح کو نظر انداز کردیتا ہے اور اقبال کی نگاہ مطلوب و مقصود کے حسن و قبح پر بھی رہتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا جوش و خروش چشم بصیرت رکھنے والوں کے لئے بانگِ درا اور ضربِ کلیم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس دور میں اس دور اندیش فلسفی شاعر کے کلام و پیام کو حرزِ جاں

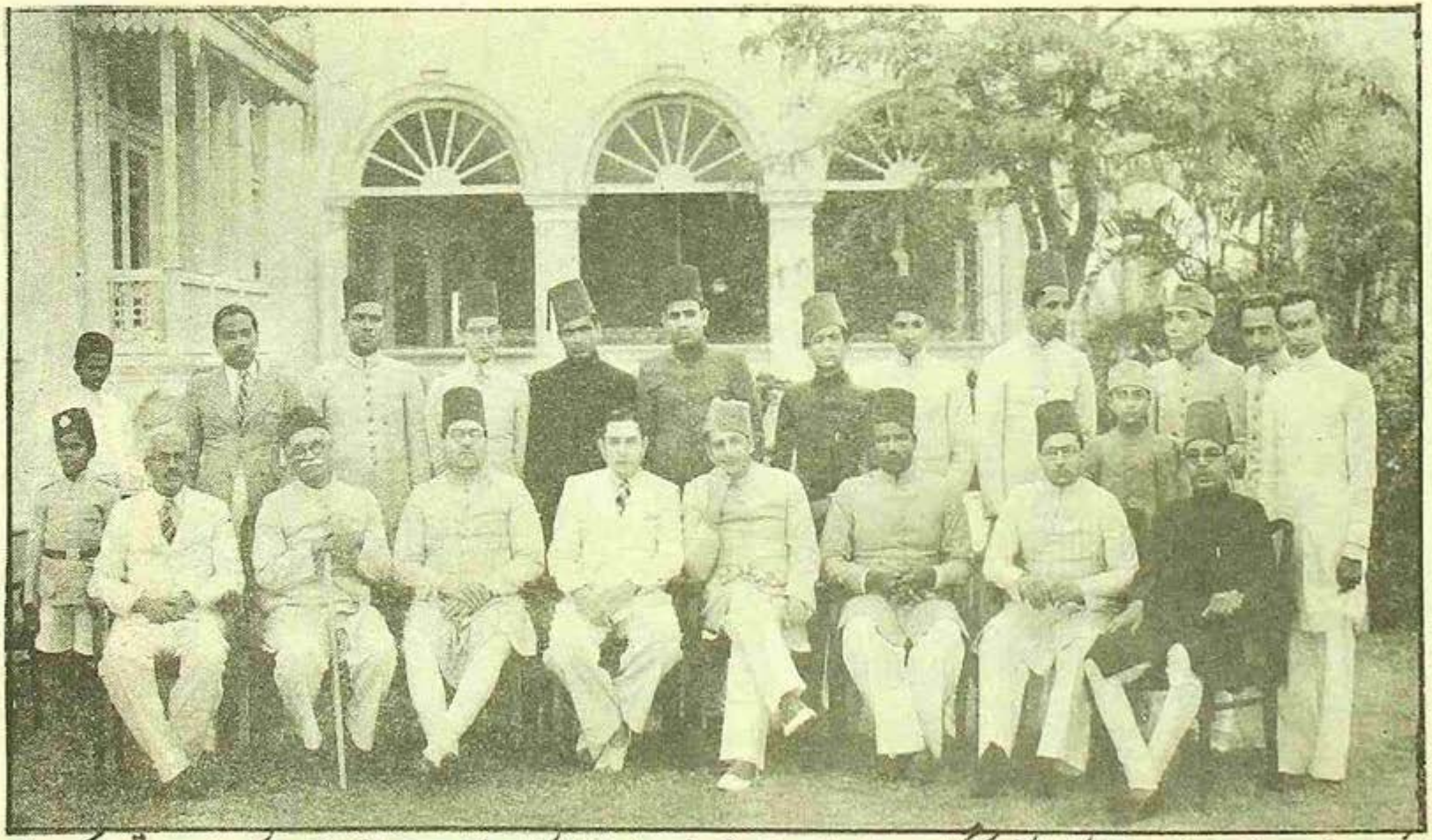

جولائی ۱۹۴۴ء کو حیدر آباد میں کلام اقبال کی نمائش کی گئی۔ وزیر مال جناب غلام محمد نے اس کا معائنہ کیا اور مرکزی بزم اقبال کے اراکین کے ساتھ تصویر کھنچوائی
اس تصویر میں بیٹھے ہوئے نواب حسن یار جنگ، امام بیگ رونق، اے ایس عبدالقادر، دوست محمد خاں، عبدالرزاق راشد اور (ایستادہ) معین الدین
کولاس، آغا حیدر حسن، مخدوم محی الدین، احمد اللہ قادری اور دوسرے افراد نظر آرہے ہیں۔

بنائیں

غلام محمد اور حسن یار جنگ کا خطاب

جب نواب بسالت جاہ بہادر اپنی افتتاحی تقریر ختم کر چکے تو نواب حسن یار جنگ نے (جو مجلس استقبالیہ کے صدر بھی تھے) خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ یہ خطبہ اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ اس میں سلاطین آصفی کی علم دوستی، ادب پروری اور معارف نوازی کے واقعات تفصیل سے بیان کئے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ ہر اہلِ کمال کے جسم پر حیدر آباد ہی کی قدر دانی اور قدر افزائی کا جامہ درست آیا ہے نواب حسن یار جنگ نے کہا:

"اقبال کے انتقال کے بعد سے نہ صرف ان کے وطن پنجاب میں بلکہ تمام ہندوستان میں ان کے کلام و پیام کو سر آنکھوں پر جگہ دی گئی اور متعدد اداروں نے یومِ اقبال منانا شروع کیا۔ یہ امر قابل مسرت ہے کہ اس سعادت میں حیدر آباد اور اہل حیدر آباد کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ پیش پیش ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اقبال کی جیسی قدر افزائی حیدر آباد میں ہوئی وہ کہیں نظر نہیں آتی۔"

اس کے بعد نواب حسن یار جنگ نے غلام محمد وزیر خزانہ کا عوام سے تعارف کراتے ہوئے صدارت کی درخواست کی:

"میں آنریبل غلام محمد صدر المہام فنانس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی علمی اور ادبی دلچسپی کے باعث گوناگوں مصروفیتوں کو چھوڑ کر اس یوم کی صدارت قبول فرمائی۔ میں ان کو ۱۹۲۰ء سے جانتا ہوں، جب وہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پروفیسر تھے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ علم ہندسہ میں ان کی سی لیاقت

بزم اقبال حیدرآباد کی سرپرستی میں پہلی تصویری نمائش جو جولائی ۴۴ء میں منعقد ہوئی تھی۔ تصویر میں دائیں سے بائیں : نواب حسن یار جنگ، خواجہ محمد احمد اور معین الدین کو لباس نظر آرہے ہیں۔

رکھنے والا مشکل ہی سے ملے گا۔ اس یوم کی صدارت کے لئے ان کا انتخاب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ انہوں نے نہ صرف اقبال کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ ان کے ہموطن اور ہم شہر بھی رہے ہیں۔

مشاہیر کے پیغامات

اس تعارف کے بعد غلام محمد وزیر خزانہ نے کرسیٔ صدارت سنبھالی تو بزم اقبال کے معتمد معین الدین کو لاس نے وہ پیغامات پڑھ کر سنائے جو اس یوم کے تعلق سے نواب حسن یار جنگ کو موصول ہوئے تھے۔

ہز ہائی نس پرنس آف برار

"یوم اقبال کی کامیابی کا دل سے متمنی ہوں جو اقبال مرحوم کی یاد میں منایا جا رہا ہے۔"

قائد اعظم محمد علی جناح ——

"زندگی کی منزل کا تعین وہی بہتر کر سکتے ہیں جنہوں نے کچھ کھویا اور کچھ پایا۔ اقبال نے بھی خود کو کھو کر خودی کو پایا اور حیاتِ ابدی حاصل کی۔ اس کی موت رونا نہیں بلکہ پیام خوشی ہے جس سے مردہ جسموں میں تازہ روح پھونکی جا رہی ہے اور باطل کا نشہ کافور ہو رہا ہے اس کے تصور کی دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو زندگی کا تعین کرو اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کرو بس یہی اقبال کا پیام تھا اور رہے گا۔"

ہز ہائی نس مہاراجہ میسور ——

"اقبال کو انتقال کئے بہت دن ہوئے لیکن ان کے نغمے ابھی

ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اقبال اور ٹیگور ہندوستان کے دو درخشاں ستارے تھے جو مشرق کے افق پر طلوع ہوئے۔ اقبال اور ٹیگور کے پیامات ابدی ہیں جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔"

راج گوپال اچاری ——

"مشرق کے شاعر اقبال کا یوم منانا مبارک ہو! اقبال نے نئی پود میں وطن سے متعلق جو احساسات پیدا کئے ہیں وہ ٹھوس اور عملی ہیں۔ سیاسی نظریات ان کے جداگانہ ہو چکے ہیں لیکن وطن سے ان کی محبت مسلم تھی۔"

خواجہ حسن نظامی ——

"جس کسی نے بھی اقبال کی موت کو سانحہ کہا وہ مردہ ہے۔ اقبال زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ ان کی وہ صورت ابھی میری آنکھوں میں ہے جب وہ محبوبِ الٰہی کی بارگاہ سے رخصت چاہتے ہوئے کچھ کہنا چاہتے تھے اور آنکھیں آنسو لا رہی تھیں۔ آخر وقت تک ان کا پیام عمل رہا اور وہ جاتے ہوئے بھی دنیا کو عمل کا پیام دیتے ہوئے گئے۔"

سر تیج بہادر سپرو ——

"شاعر اعظم اقبال کا یوم منانا آپ کو مبارک ہو! جس نے مشرق و مغرب کے رجحانات سے واقف کرایا اور صحیح راہنمائی کی۔"

نواب کمال یار جنگ ——

"اقبال شاعر ہی نہیں ریفارمر بھی تھے۔ انہوں نے نہ صرف اہل اسلام بلکہ بنی نوع انسان کو راہ راست پر لانے کے لئے ہر طرح کوشش کی جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ اہل اسلام کی صلاح و

فلاح کے لئے انہوں نے جو حصہ لیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ وہ مسلمانوں میں جذبات خودداری اور احترام نفس پیدا کرنے میں ہمہ تن مساعی رہے"

بیگم ولی الدولہ ——

"اس زمانہ میں جب کہ ماحول بدل رہا ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اقبال کے پیام ابدی کا نتیجہ ہے جنہوں نے قوم کی بیداری میں غیر معمولی حصہ لیا۔ ان کا پیام ہر طبقہ، ہر مذہب اور ہر سوسائٹی کے لئے ہے۔ وہ عالمگیر پیام لئے ہوئے آئے تھے اور عالمگیر پیام دیکر رخصت ہو گئے۔"

بیگم ظہیر یار جنگ ——

"اقبال کے پیغام محبت کی لہر تمام ہندوستان میں دوڑ رہی ہے۔ اس شاعر فلسفی نے قومی تعمیر میں جو حصہ لیا ہے وہ صفحہ ہستی پر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔"

ہز ہائی نس مہاراجہ ٹراونکور

"اقبال کے کلام اور فلسفہ کو کبھی زمانہ فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ ہماری آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گا۔"

نواب دوست محمد خان ——

"اقبال کی تعلیمات اسلامی فلسفہ پر مبنی ہیں۔ خدا کرے ان کے فلسفۂ خودی جو "ہم نے انسان کو اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے" کی صحیح تفسیر ہے، مقبول عام ہو اور پوری قوم اس سے استفادہ کرے۔"

مولوی سجاد مرزا ——

"ٹیگور سے اقبال کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ٹیگور ایک

فلسفی ہے جو عالم خیال میں رہتا ہے اور اقبال ایک مفکر ہے جو مسائل عالم کو حل کرتا ہے۔"

اقبال کا فلسفۂ خودی

"غلام محمد وزیر خزانہ کی اقبال سے دوستی تھی وہ لاہور اور علیگڑھ میں کئی بار اقبال سے مل چکے تھے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اقبال سے متعلق اپنی یادداشتیں بیان کریں گے۔ اس کی بجائے انہوں نے اپنی جیب سے اقبال کے فلسفۂ خودی پر لکھی ہوئی ایک تقریر نکالی اور اسے پیش کرنے سے پہلے کہا۔

"بزم اقبال، علمی حلقوں میں اقبال کے کلام، ان کی تعلیم اور ان کے پیام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں جو کام کر رہی ہے وہ ہر طرح سے نہ صرف حیدرآباد والوں کے لئے بلکہ حیدرآباد کے باہر تمام ہندوستان والوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ مجھے امید ہے کہ بزم اقبال کی علمی سرگرمیاں اس سے زیادہ مفید اور پہلے سے زیادہ وسیع تر ہو جائیں گی۔"

غلام محمد نے اقبال کے حالات و ماحول کا تفصیل سے ذکر کیا۔ یورپ کے سیاسی اور معاشی رجحانات پر روشنی ڈالی۔ نطشے کے تصور فوق البشر سے بحث کی۔ پھر اقبال کے نظریۂ خودی سے اس کا مقابلہ کیا اور نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"اقبال کا خطاب نوجوانوں سے ہے۔ وہ ان ہی کو فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ نوجوان اقبال کے شعر پڑھتے اور لطف اٹھاتے ہیں مگر ان کو یہ پیام یاد نہیں رہتا کہ اپنی

سیرت کو درست کرو، اولوالعزم رہو، تمہارے کام، تمہاری کوششیں سب اللہ کے لئے اور انسانیت کے لئے ہونی چاہیئں۔ اس کے بجائے وہ روزمرہ کے تعصبات سے متاثر ہیں اور ان میں یہ حوصلہ نہیں کہ وہ دنیا کی سختیوں کا مقابلہ کرسکیں۔ حضرات، اقبال کے پیام کا صحیح مطالعہ کیجئے جو انسانیت کے لئے ہے خاص مسلمانوں کے لئے نہیں، وہ پیام نہ ہندو، نہ مسلمان، نہ پارسی، نہ ترکی کے لئے مخصوص ہے بلکہ تمام انسانیت کے لئے ہے"۔

اس کے بعد مقالوں اور نظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سید محمد اکبر وفاقانی ڈاکٹر میر ولی الدین، نواب میر اکبر علی خاں، آغا حیدر حسن مرزا، انور خاں جامعی رائے سری کشن، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر سید محمد سجاد اور احمد عبد اللہ المسدودی نے اقبال کی شخصیت و فن کے بارے میں مضامین اور مقالے پڑھے۔ علی اختر حیدر آبادی، پنڈت راگھو بیندراو جذب، نظر حیدر آبادی، کاہش حیدر آبادی گردچرن داس، سکینہ عاجز اور محمد علی نیر نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔[1]

اخبارات کا خراجِ تحسین

یہ یوم اقبال ایک عرصہ تک نوجوانوں کا موضوع بنا رہا۔ ملک کے تمام ہی اخبارات نے اس کی کامیابی پر تعریفی شذرہ اور اداریہ لکھے۔ روزنامہ 'سلطنت' اپنی ۱۱ خورداد ۵۲ھ فصلی کی اشاعت میں لکھتا ہے

۱۔ یہ سب مقالے اور نظمیں مختلف رسالوں اور کتابوں میں شامل ہوچکی ہیں، اس لئے ہم نے ان کو یہاں نقل کرنے سے گریز کیا ہے۔

"بزم اقبال اس حیثیت سے قابل مبارک باد ہے کہ اس نے علامہ اقبال کی یاد آج کے علاوہ سابقہ برسوں میں شاندار انتظامات اور کافی اہتمام سے منائی۔ اس طرح ایک بڑے شاعر اور مفکر کے حیات افروز پیغام اور تعلیمات سے پھر ایک مرتبہ اہلِ حیدرآباد کو روشناس ہونے کا موقع فراہم کیا۔ عوام کے ذہنی تصورات اور طبعی رجحانات میں ہلچل پیدا کر کے ان کے لئے سامانِ غور و فکر مہیا کیا اور ان کے کلام کی خصوصیات اور فیوض و برکات کو منظرِ عام پر لاکر ان کی شخصیت، عظمت اور شہرت کا پورا پورا حق ادا کیا۔"

حیدرآباد کا ایک اور ممتاز روزنامہ "رہبر دکن" رقم طراز ہے۔

"بزم اقبال نے زمرد محل تھیٹر میں یوم اقبال منایا اور اس طرح اقبال کی تعلیمات سے اہل ملک کے لئے ایک رہبری اور حرارت حاصل کی۔"

اسی اخبار نے اپنی ایک اور اشاعت میں لکھا ہے:

"یہ حضرت اقبال کی روحانی کشش کا اثر ہے کہ یوم اقبال بیحد کامیاب رہا۔ صاحبزادہ نواب بسالت جاہ نے ایک فاضلانہ خطبہ سے اس کا افتتاح فرمایا اور آخر وقت تک خطبہ گاہ میں موجود رہے نواب حسن یار جنگ نے ایک بہت اچھا خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ اسمیں اقبال کی خصوصیات شاعری پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ غلام محمد صدر المہام فنانس نے بھی ایک اچھی تقریر کی اور ایسی جامعیت کے ساتھ آپ نے اقبال اور ان کے شاعری کے ارتقاء کو پیش کیا کہ ان لوگوں کی کم بینی کا بھی علاج ہو گیا ہو گا جو اقبال جیسے مفکر کے ابتدائی دور

کے کلام کے ایک حصہ کو لے کر دوسروں کو مغالطہ میں مبتلا کرتے ہیں"۔

لندن کی مجسمہ ساز خاتون

جس روز یومِ اقبال کی کامیابی پر مختلف روزناموں میں تعریفی شذرہ شائع ہوئے اسی روز قاضی عبدالغفار کے روزنامہ پیام میں جے جے آرٹ اسکول آف بمبئی کے پرنسپل کی اہلیہ اور لندن کی مشہور مجسمہ ساز خاتون ڈورس جیرارڈ کا ایک تفصیلی بیان شائع ہوا۔ وہ اس یوم میں شروع سے آخر تک موجود رہی تھیں انہوں نے اس سلسلہ میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آج صبح میں ایک کھچا کھچ بھرے ہوئے سینما ہال میں بیٹھی ہزاروں کے مجمع کو دیکھ رہی تھی جو مجسم شوق بنا اقبال پر مقالے، نظمیں اور تقریریں سن رہا تھا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کا مستقبل بہت شاندار ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں سارے نوجوان عہدِ حاضر کے بہت بڑے ترقی پسند شاعر کے پرستار ہیں۔ یقینی طور پر گہرے احساسات اور عمیق جذبات کو پرورش دے سکتا ہے۔ ہم جنگ سے پہلے انگلستان میں دو ہزار نوجوانوں کا بھی مجمع اکٹھا نہیں کر سکتے تھے جس میں تمام طبقات کے نوجوان یہاں تک کہ ادنیٰ متوسط طبقے کے نوجوان صبح ساڑھے آٹھ بجے ایلیٹ، آڈن یا لوشس۔ جیسے شاعروں کا کلام یا تعریف سننے کے لئے جمع ہوں۔

شہ نشین پر امیروں، وزیروں اور شاعروں کی نشستیں تھیں اور حاضرین میں جوان بوڑھے سب بیٹھے ہوئے تھے جو اقبال سے متعلق ایک ایک لفظ سننے کے مشتاق نظر آتے تھے۔ میں اوپر گیلری میں

بیٹھی اس پُرشوق مجمع کو دیکھ رہی تھی سارا ہال ہمہ تن توجہ تھا۔ نہ جانے شاعر کے فکر و خیال کے کونسے گوشے بے نقاب ہو رہے تھے۔ بدقسمتی سے مجھے اُردو نہیں آتی اور میں اقبال کے صرف اس کلام سے واقف ہوں جس کا ترجمہ ہو چکا ہے مگر ان ترجموں سے اس حقیقت کو پالیا ہے جو شاعر کے دل میں شرارہ بن کر چمک رہی تھیں"۔

اپنے بیان کے آخر میں محترمہ نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔

"میں صرف مجسمہ ساز ہوں، عبارت سازی میرا کام نہیں میں نے جو کچھ کہا ہے جذبات کی شدت سے مجبور ہو کر کہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں کسی وقت اقبال کی کسی نظم یا شعر کو مجسمہ کی شکل دوں۔ غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے۔ اگر میں اقبال کے اس مصرعہ کا پیکر تراشوں تو وہ ایک یادگار چیز ہو گی"۔

ایک ولولۂ تازہ

۴۳ء کے یومِ اقبال نے عوام کے ذہنوں پر غور و فکر کے دریچے ہی نہیں کھولے تھے بلکہ ایک نیا ولولہ اور حوصلہ بھی دیا تھا۔ بزمِ اقبال کے عہدہ دار اس ولولہ اور حوصلہ کو کامرانی کی آخری منزلوں پر دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ ۴۴ء کا آغاز ہوتے ہی نواب حسن یار جنگ نے یومِ اقبال منانے کی تیاریاں زور شور سے شروع کر دیں عوام کے جوش و جذبہ کو دیکھتے ہوئے اخبارات بھی مجبور ہو گئے کہ وہ بزمِ اقبال کی چھوٹی سے چھوٹی خبر اور بڑے سے بڑے اعلان کو نمایاں طریقہ پر شائع کریں۔ چنانچہ تین مہینہ سے زائد عرصہ تک بزمِ اقبال کی سرگرمیوں اور اس کے عہدیداران کی مصروفیتوں کا اخبارات میں چرچا رہا۔

مہدی یار جنگ کا اظہارِ سپاس

بزمِ اقبال ہر سال ملک کی کسی اہم شخصیت کو یومِ اقبال کے افتتاح کے لئے مدعو کرتی چلی آرہی تھی۔ اس سال طے کیا گیا کہ نواب احمد سعید چھتاری (جو ریاست حیدرآباد کے صدر اعظم تھے) افتتاح کی درخواست کی جائے۔ نواب احمد سعید چھتاری کی اقبال سے دوستی رہی تھی۔ وہ ہندوستان کے علاوہ یورپ میں بھی کئی مرتبہ ان سے مل چکے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے بمبئی سے لندن تک اقبال کے ساتھ یورپ کا سفر بھی کیا تھا۔ جب نواب حسن یار جنگ نے ان سے اس یومِ اقبال کی صدارت کی درخواست کی تو انہوں نے اسے بخوشی قبول کر لیا اور یقین دلایا کہ وہ اپنے مرحوم دوست اقبال کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے سلسلہ میں کسی حیدرآبادی سے پیچھے نہیں رہیں گے لیکن، عین وقت پر بیمار ہو جانے کی وجہ سے معذرت کر لی۔ اس صورتِ حال سے بزمِ اقبال کے عہدیداروں کو پریشانی ضرور ہوئی لیکن انہوں نے نواب مہدی یار جنگ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس یوم کا افتتاح فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے ۲۱ر اپریل کو حیدرآباد کے تاریخی مقام باغ عامہ کے لئے ٹاؤن ہال میں اس یوم کا افتتاح کرتے ہوئے اقبال کو شاندار لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

"اقبال کی شاعری زندگی اور اس کی حرارت سے مملو ہے۔ وہ ہم کو خودی کی تعلیم دیتے ہیں۔ خودی ان کے نزدیک ایک انسانی ارتقا کا ایک بہت بڑا زینہ ہے جس پر چڑھ کر ہی انسان اپنی استعداد کو بیدار کر سکتا ہے۔ یہی خودی اس میں قوتِ عمل پیدا کر کے ذات و کائنات کے نئے اُفق روشن کرتی ہے۔ اقبال کی خودی کا سرچشمہ قرآن ہے۔ قرآن انسان کو خلیفۃ اللہ کہتا ہے اور خلیفۃ اللہ ہونے کا صحیح ادراک مشرق کی بے حسی کو جد و جہد سکھاتا ہے۔"

بہادر یار جنگ اور اقبال

جب مہدی یار جنگ اپنی افتتاحی تقریر ختم کر چکے تو اُردو زبان کے فقید المثال خطیب اور فکر اقبال کے شعلہ بیاں مبلغ نواب بہادر یار جنگ نے اپنی دل آویز مگر ذہنوں کو مرتعش کرنے والی آواز اور دلوں میں اُتر جانے والے الفاظ میں تحریک صدارت کی۔ انہوں نے کہا۔

"میں سمجھتا تھا آج مجھے تقریر کرنا ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ یہ فرض میرے سُپرد کیوں کیا گیا جب کہ مجھے انوری ہونے کا دعویٰ ہے نہ قانی، ہونے کا۔ بہرحال ایک اقبال آفریدہ شاہین زادہ کی بزم اقبال کے اس جلسہ کی تحریک صدارت کے لئے کھڑا ہوں۔

حضرات! آج تہذیب مشرق آپ اپنا خون بہانے میں مصروف ہے۔ شاخِ نازک پر بنے ہوئے آشیانے ایک ایک کر کے توڑے جا رہے ہیں۔ آج کسی کا آداب خود آگاہی سے واقف ہو جانا غلاموں کو شہنشاہی کے رموز سے واقف کرا دینا ہے۔ آج کسی کی ہوس رانی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کر رہی ہے۔ آج جاوید نامہ کا قلزم خونی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آج ہندوستان کے پاؤں کی بیڑیاں وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں اور روحِ جعفر تنِ دیگر کی تلاش میں پھر رہی ہے ان حالات میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک صحیح آدمی ہی اس جلسہ کی صدارت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ جو نگاہِ بلند رکھتا ہے جس کا سخن دلنواز ہے اور رُوح پُرسوز، جو آفاق میں گم نہ ہو گئی ہو بلکہ آفاق کو اپنے میں گم کر لیا ہو۔ جس نے خاکبازی نہ سیکھی ہو بلکہ خودی کا درس سیکھ کر دوسروں کو خود آگاہ بنا دیا ہو

اور میں یہ جذبہ نواب حسن یار جنگ بہادر میں بیدار ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ابھی بانگِ درا بند نہیں ہوئی ہے ضربِ کلیم کی تاب کس کو ہے اور ضربِ کلیم کی تاب لانے کی کون ہمت کر سکتا ہے۔ جاؤ۔ پیامِ مشرق اس کے بعد کی منزل ہے۔ شاید مسلمانوں کا یہ "ڈی جنریٹڈ" وہ طبقہ جس کو بیدار کرنے کے لئے اقبال کھڑا ہوا جس دن وہ بیدار ہو جائے گا اقبال کو پڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس عہد میں جبکہ بانگ درا کانوں سے اُتر کر قلب سے قریب تر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کو ہی مقامِ شکر سمجھتا ہوں۔ حیدرآباد کے ایک شاہین زادہ کو جس کے اجداد کی شاہینیت حیدرآباد کے ہر باب پر ثبت ہے، جو حیدرآباد کی قسمت کو بدلنا چاہتا ہے۔ آج کے جلسہ کی صدارت کیلئے پیش کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحریک صدارت کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنا ٹھیک نہیں کہ اقبال نوجوانوں کے لئے تڑپ کر مرا ہے اور آج ایک نوجوان اقبال کے جلسہ کی صدارت کر رہا ہے اس طبقہ سے جس سے میں مایوس ہوا جا رہا ہوں، یہ امید کی ایک کرن سے کم نہیں"۔

بہادر یار جنگ کو ملک کے نوجوان طبقہ سے بہت امیدیں تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہی طبقہ ملک و قوم میں فکری انقلاب برپا کر سکتا ہے جب انہوں نے اس جلسہ کی صدارت کے لئے نواب حسن یار جنگ کا نام پیش کیا تو بعض بڑے بوڑھوں کے ماتھے پر شکن ضرور آئی لیکن ہزاروں نوجوانوں میں نیا عزم و حوصلہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ بیرسٹر اکبر علیخاں نے بہادر یار جنگ کی تحریک کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کا حق قائد ملت مولوی بہادر خاں، بہادر یار جنگ کو ہی حاصل ہے۔ آج

جب حیدرآباد کے مسلمانوں کا یہ واحد نمائندہ شخص نواب حسن یار جنگ
کے لئے تحریک صدارت کر چکا ہے تو میں اس کی دل سے تائید کرتا ہوں"

نواب حسن یار جنگ کی تقریر

نواب حسن یار جنگ کو اقبال کی شخصیت اور شاعری سے والہانہ محبت تھی۔ وہ اس کے پیام کو ہر قسم کے اعزاز سے بے نیاز ہو کر عوام تک پہنچا رہے تھے۔ جب بہادر یار جنگ نے ان کی صدارت کی تحریک اور بیرسٹر اکبر علی خاں نے تائید کی تو وہ کرسیٔ صدارت سنبھالنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں نہ صرف بزم اقبال کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی بلکہ نام بہ نام اپنے رفقائے کار کی کوششوں کو بھی سراہا جو ان کے ممد و معاون رہے تھے۔ ان کی اس تقریر کا اہم حصہ وہ ہے، جس میں انہوں نے حیدرآباد اور اقبال کے موضوع پر روشنی ڈالی، انہوں نے کہا۔

"یہ ایک واقعہ ہے کہ علامہ اقبال کے کلام و پیام کو جو مقبولیت ریاست حیدرآباد میں حاصل ہوئی ہے اور ہو رہی ہے وہ پنجاب کو چھوڑ کر شاید ہی اور کسی علاقے میں ہوئی ہو بلکہ اکثر حضرات کا خیال تو یہ ہے کہ جتنی تحقیق اور جس قدر نشر و اشاعت علامہ کے کلام کی حیدرآباد میں ہوئی ہے وہ شاید پنجاب میں بھی نہیں ہوئی۔ یقیناً جس شاندار پیمانے پر علامہ اقبال کا یوم یہاں منایا جاتا ہے پنجاب میں بھی نہیں منایا جاتا۔ علامہ اقبال کے کلام کو سب سے پہلے ایک حیدرآبادی یعنی مولوی عبدالرزاق راشد نے ہی جمع کر کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ کلیاتِ اقبال کے نام سے شائع کیا تھا۔ علامہ کی حیات ہی میں علامہ کا جشن منایا گیا جس کی صدارت والاشان شہزادہ ولیعہد بہادر نے فرمائی۔ حیدرآباد میں جس قدر علم دوست حضرات علامہ اقبال

کے کلام کا محققانہ مطالعہ کرتے اور علامہ کے کلام پر مقالے اور کتابیں لکھتے ہیں اور علاقوں میں اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے اکثر تصانیف محققانہ اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔"

اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے نواب حسن یار جنگ نے قوم کے نوجوانوں سے کہا۔

"یہ آپ سے مخفی نہیں ہوگا کہ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہم جس دور سے گزر چکے ہیں اس میں عوام کی ذمہ داریاں بہت کم تھیں۔ آج جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں عوام کی ذمہ داریاں بڑھ رہی ہیں۔ مستقبل میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ہم خواب سے جاگ پڑے ہیں لیکن مکمل طور پر نہیں۔ ابھی بیداری کی منزل دور ہے ہم کو جلد سے جلد بیدار ہونا چاہیئے اور اپنے آپ کو ان اعلیٰ خصوصیات کا حامل بنانا چاہیئے جن کا درس اقبال نے بار بار اپنے کلام میں دیا ہے۔"

مشاہیر کے پیغامات

جب نواب حسن یار جنگ اپنی صدارتی تقریر ختم کر چکے تو بزم اقبال کے معتمد معین الدین کو اس نے ان سینکڑوں پیغامات میں سے چند پیغامات سنانے کی اجازت چاہی جو اس موقع کے لئے اندرون ریاست اور بیرون ریاست سے موصول ہوتے تھے۔ جو پیغامات سنائے گئے وہ یہ ہیں۔

شہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر شجیع

"مقام مسرت ہے کہ حیدر آباد میں ایک بہت بڑے شاعر کا

یادگاری ہفتہ منایا جارہا ہے۔ اقبال اس دور کا لائقِ احترام شاعر تھا جس نے اپنے اشعار کے ذریعے ایک مکمل نظامِ فکر پیش کیا۔ اس کی شاعری میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن سے زندگی کے اصول مرتب کئے جاسکتے ہیں، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اقبال کی شاعری کا مخاطب کوئی خاص طبقہ یا کوئی خاص مکتب خیال تھا۔ اس کے کلام میں ایک ایسی اپیل پائی جاتی ہے جو براہ راست انسانیت کو متاثر کرتی ہے اس کا پیام انسانوں کے لئے ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے مقصد میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اپنی شاعری کو پہلے ایک خاص جماعت میں پھیلانے کی کوشش کی۔ ایسے عظیم المرتبت شاعروں کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دیں اور سوئی ہوئی قسمتوں کو بیدار کریں۔ انہیں میں ایک اقبال بھی تھا۔ اقبال مفکر بھی تھا اور شاعر بھی۔ اقبال وہی کہتا تھا جو ہمارے دل میں ہوتا تھا مگر اس کے دل کی ٹیس اور اس کے دل کی قوت الفاظ میں بھری ہوئی تھی۔ اقبال وہی کہتا تھا جو بہت سے کہنا چاہتے تھے مگر نہیں کہہ سکتے تھے۔"

نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال ـــــ

"زندہ قوم اپنے مفکرین کو کبھی نہیں بھولتی اور پھر اقبال جیسا مفکر جس نے انسانیت کو اپنی حقیقت کا صحیح احساس دلایا۔ اسے ہماری قوم کیونکر بھول سکتی ہے۔ میں اقبال کا مداح ہوں اور اس کے کلام سے بصیرت حاصل کرنا اپنے لئے باعثِ فخر تصور کرسکتا ہوں۔ اس مفکر پر جتنی بھی تصانیف ہوں اور جتنے بھی جلسے ہوں، وہ ہماری بیداری کے ضامن ہوں گے۔"

ہز ہائی نس مہاراجہ میسور ـــــــ

"اقبال کے پرستاروں کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اس سے ہندوستان کے صحیح رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ ٹیگور کی طرح اقبال بھی ایک پیام رکھتا ہے جو عمل ہے، مبارک ہیں وہ ہستیاں جو عمل سے زندہ رہتی ہیں۔"

ہز ہائی نس صادق عباسی نواب بہاولپور ـــــــ

"جس نے سوتی ہوئی قوم کو جگایا اور اپنے پیام سے ارادوں میں استحکام بخشا، اس اقبال کی یاد منانا آپ کو مبارک ہو"

قائداعظم محمد علی جناح ـــــــ

"زندگی کو اگر عمل بنانا چاہتے ہو تو اس فن کو اقبال ہی سے سیکھو جس نے مردہ جسموں میں وہ حرارت پیدا کردی جو کبھی سرد نہیں ہوسکتی اقبال نے عمل اور خیال کی مدد سے ہماری تعمیر کا جو خاکہ سوچا تھا وہ اب مکمل ہورہا ہے۔ صرف اس پر حاشیہ چڑھانا باقی ہے۔ اس راز کو میں آج اسی کی سرزمین سے فاش کررہا ہوں۔ بڑھے جاؤ، ساحل تھوڑی دور ہے، علم بلند ہے، اس فاصلے کو بھی طے کرلو، کامیابی تمہارے ساتھ ہے۔ اور پھر یہ ترانہ گاؤ ـــ 'دنیا فانی اقبال باقی'۔"

بیگم صاحبہ ولی الدولہ ـــــــ

"اقبال قوم کا صحیح معلّم اور نقیب تھا۔ اس نے تنظیم اور بیداری کے لئے جو کوشش کی وہ سارے عالم کے لئے درس بصیرت ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو احساسِ کمتری کا شکار ہونے سے بچایا۔ ضرورت ہے کہ اس معلم اعظم کے پیام کو حیدرآبادی اپنا لائحہ عمل بنائیں اور عملی دنیا

میں مسلم اقدار کے اجاگر کرنے کے لئے بہتر راہیں تلاش کریں۔"

نواب ظہیر یار جنگ ـــــــ

"اقبال دنیا کے لئے ایک پیام لیکر آیا تھا۔ اس کا پیام حیات انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس کا گوہر مقصود ایک ، نصب العین اور ایک نصب العینی سماج ہے۔ ایسا سماج جس کی بنیادیں انسانیت کے احترام پر قائم ہوں اور جس کے افراد ایک طرف اپنی خودی کو بلند کر کے اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھوں سے بنائیں تو دوسری طرف بے خودی کی پابندیوں کا بھی احترام کریں۔ اقبال کی نظر بڑی وسیع اور دور رس تھی۔ مغرب کی مادی تعمیر میں تخریب کی جو قوتیں کام کر رہی تھیں ان کی طرف اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تہذیب اپنے ہاتھوں اپنے خنجر سے خودکشی کریگی" چنانچہ یہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ مغرب کی حیات کے ابلیس عناصر یعنی محوری قوتیں آخر اسے تباہی کے گڑھے میں ڈھکیل رہی ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اقبال ایک حیات بخش اثر کی حیثیت سے ہماری زندگی میں روز افزوں حیثیت حاصل کرتا جارہا ہے۔

آنریبل غلام محمد ـــــــ

"اقبال کے پیام کو عام کرنے کے لئے بزم اقبال نے جو جدوجہد جاری کر رکھی ہے وہ عام ذہنی بیداری کا ایک اچھا ذریعہ ہے مجھے امید ہے کہ ان کے نغمے بجھے ہوئے دلوں کے لئے تازگی اور شگفتگی کی ایک ہلکی پھلکی لہر نہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ ان کا سارا کلام زندگی کا ایسا درس ہے جس پر عمل کرنے کے بعد زندگی بدل سکتی ہے۔ وہ پریم اور شانتی کے پجاری تھے۔ اس لئے

نوجوانانِ ملک کو اس عظیم شخصیت کی زندگی کی تقلید سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور وہ جس محکم عمل کو حیات و کائنات کے لئے ضروری سمجھتا تھا اس پر کاربند ہونا چاہیئے۔ خدا کرے کہ اقبال کے پیام سے مشرقی دُنیا جاگتی رہے"۔

سر تیج بہادر سپرو ــــــ

ہفتہ اقبال کی کامیابی کا میں دل سے خواہاں ہوں اقبال ہمارے ملک کا بہت بڑا شاعر ہے، جو صدیوں میں نصیب ہوتا ہے"۔

بیگم ظہیر یار جنگ ــــــ

"آپ نے ایسے شاعر کی یاد کو تازہ رکھنے کی کوشش کی ہے جس کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کو عمل اور خیال سے فائدہ پہنچائے"۔

راجگوپال اچاری ــــــ

"ہمارے لئے قابلِ فخر ہے کہ اقبال جیسا مصلح ہندوستان میں پیدا ہوا جس کی واحد تمنا آزادی کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ اقبال اور ٹیگور ہمارے سرپیچ کے دو جگمگاتے نگینے ہیں۔ یہ زمانہ کتنا بھی بدلے ان کی جگمگاہٹ اور آب و تاب میں کمی نہیں آئے گی"۔

سر عبد القادر ــــــ

"جس قدر زمانے پر اقبال کا گہرا اثر ہے اس سے زیادہ اور گہرا اثر زمانہ حاضر کے نوجوانوں پر ہے اور خاص طور پر مسلم نوجوانوں پر جن سے اس نے زیادہ تر تخاطب کیا ہے۔ اقبال نے نوجوانوں میں اسلامی روح کے بیدار کرنے میں حقیقی کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک ایسے عبوری دور کے لئے پیش گوئی تھی جو سابقہ جنگِ عظیم اور حالیہ عالمگیر جنگ

کی غارت گری کے واقعات جو ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے ہیں۔ اس نے پہلے ہی دنیا کو باخبر کر دیا تھا اور خصوصاً مغربی اقوام کو کہ یہ مادی حرص و آز تم کو ایسی آفات میں مبتلا کر دے گا جس کا نتیجہ صرف تباہی ہو گا۔ جب تک تم روحانی تعلیم کو اس مادی دور میں حاصل نہ کرو۔ اس نے مشرق کو مغرب کی تقلید سے بچنے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے افکار نہ صرف مشرق بلکہ مغرب کے لئے بھی قابلِ عمل ہیں"۔

عبدالماجد دریا آبادی

"اقبال نے خودی کا درس دیا ہے۔ خودی ان کی اصطلاح میں خودشناسی کا دوسرا نام ہے اور خودشناسی مقدمہ اور زینہ ہے خُداشناسی کا۔ جس نے خود کو پہچان لیا اس نے خُودی کو پہچان لیا۔ اقبال کی خودی خُدا سے دور کرنے والی نہیں خدا تک پہنچانے والی ہے"۔

نواب احمد سعید چھتاری ——

"اقبال شاعر ہی نہیں تھا مفکر اور حکیم بھی تھا۔ اس نے تاریخ عالم کا غائر نظر سے مطالعہ کیا اور ماضی کے دھندلے نقوش اُجاگر کر کے حال و استقبال کے بارے میں اپنے افکار پیش کئے۔ ان کی روشنی میں ایک نئی دُنیا، نئے تمدن نئے نظام اور ایک نئی کائنات کی تعمیر کا کام انجام پا سکے اور ملتِ اسلامیہ کی نئی تعمیر اس کی مخاطب اور اس کی امیدوں کا گہوارہ تھیں، وہ اپنے مقصد میں کامیابی تک کامیاب ہوا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف ہمارے نوجوان دے سکتے ہیں۔ خدا انہیں توفیق دے کہ اقبال کے پیام کو سمجھیں اور اسے فنکارانہ جذبہ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

پانچواں باب

مصوروں سے اپیل

اچھے شعر بھر اچھے شعر ہیں! ان کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نقاد سے لیکر قاری تک سب ہی ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جب کوئی مصور ان کو اپنے برش، قلم اور رنگوں کی مدد سے پیکر تصویر عطا کرتا ہے تو ان میں ایسی معنویت پیدا ہو جاتی ہے جن کا اظہار بڑے سے بڑے شارح اور بڑے سے بڑے مترجم کے لئے ممکن نہیں رہتا ہے۔ وہ سب نقش و نگار کی گویائی کے آگے گنگ رہ جاتے ہیں یہی وہ وجہ تھی جس نے ذہنوں پر غور و فکر کے دریچے کھولے اور بزم اقبال کے عہدیداروں کو اس حقیقت پسندانہ نکتہ تک پہونچنے میں مدد دی کہ اقبال کے کلام کو تصویروں کے ذریعہ زیادہ آسان اور عام فہم انداز میں عوام تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اقبال کے کلام کی حسن کارانہ تشریح کی ضرورت کو محسوس کرنے میں پہل کی اور اپنے دستور میں اس امر کا اعلان کیا کہ وہ ہر یوم اقبال کے موقع پر اقبال کے کلام سے متعلق تصویری نمائشوں کا انعقاد بھی کریں گے کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ عوام کو اقبال شناسی کی

چیمبر لین - راوی روڈ لاہور
27-12-75

مکرم معظم جناب نواب حسن یار جنگ بہادر

السلام علیکم۔ گزشتہ دنوں ایک صاحب کے ہمراہ دست بدست حاضر خدمت ہوا تھا
جسے کہ چغتائی صاحب کی یادگار رہ جانے کی کتاب عمل چغتائی (مرقع اقبال)
آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھی لیکن وقت کی تنگی سے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی
تھی۔ آپ کے صاحبزادے کو دے دی گئی امید ہے آپ کو مل گئی ہوگی۔
یہ کتاب چغتائی صاحب نے اپنی زندگی میں آپ کے لئے رکھی تھی مگر ان کی
علالت کے باعث میرا کراچی آنا نہیں ہوا تھا جس سے آپ تک ان کی زندگی
میں پہنچ نہیں سکی۔ اب اتفاق سے آنا ہوا تو یہ فرض ادا کرنا پڑا۔
آپ تو اقبال کے مصور چغتائی کے بہت بڑے قدردان تھے اور آپ ہی نے
آپ نے حیدرآباد میں اقبال ڈے منانا شروع کیا گویا بڑا کام کیا کرتے تھے مگر وہ
حیدرآباد سے جب ۱۹۴۸ میں ہنگامی حالات میں آپ نے منتقل کیا [illegible]
[illegible]

۱۹۷۶
امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ہم گزشتہ جنوری کو ۱۷ تاریخ کو
چغتائی صاحب کی سالگرہ اپنے طور پر اپنے گھر پر بلکہ اسی جگہ جو مرحوم
نے اپنی زندگی میں اپنا میوزیم قائم کرنے کو تھی منعقد کر رہے ہیں۔
آپ ان کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں مرحوم آپ کی دلی طور پر
عزت کرتے تھے اور خلوص رکھتے تھے امید ہے آپ ان کے خلوص
اور محبت سے جو ان کو آپ کی ذات سے تھی ضرور متاثر ہوں گے۔

سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔

فقط میں ہوں آپ کا خادم

عبدالرحیم چغتائی
برادر مرحوم چغتائی صاحب

میں دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا
مگر مختصر قیام اور بارہ ربیع الاول وفات کے باعث حاضر نہیں ہو سکا
اگر زندگی رہی تو دوبارہ کبھی ملاقات ہوگی

عبدالرحمٰن چغتائی کے بھائی عبدالرحیم چغتائی کا خط حسن یار جنگ کے نام

منزل تک پہونچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں بزمِ اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ نے حیدر آباد اور بیرون حیدر آباد کے تمام مصوروں سے ذاتی طور پر اپیل کی کہ وہ اپنے حسن کارانہ ذوق کی مدد سے افکارِ اقبال کی رفاقت کا حق ادا کریں۔ جس زمانے میں یہ اپیل کی گئی تھی وہ زمانہ بے مقصد حسن کاری سے عبارت تھا۔ فن برائے فن کی تحریک زوروں پر تھی۔ مغرب کی بے نام رنگ طرازی کو فن کی معراج خیال کیا جاتا تھا۔ رنگ و روغن کی مدد سے انقلاب آفریں تصورات کی پہنائیاں کتنی جاندار ہوتی ہیں، اس پر کسی نے بھی غور نہیں کیا۔

جب اس اپیل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو مدرسۂ فنونِ لطیفہ حیدر آباد کے پرنسپل خان بہادر سید احمد نے بزم اقبال کو اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ اجنتا کے اسکول آف آرٹ کے ہیجان انگیز خدوخال کو عام کرنے میں گذارا تھا لیکن اس احساس کے بعد کہ حیدر آباد کی تہذیبی، سماجی، اور سیاسی زندگی پر اقبال کی شاعری کے اثرات بہت دیرپا اور بہت گہرے ہیں اور ان سے کٹ کر کوئی فن کار زندہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے شاگردوں کو ایک نئے جوش، ولولہ اور جذبے سے سرشار کر دیا اور ان کے دل میں یہ بات جاگزیں کر دی کہ وہ ایسی کوئی تصویر نہیں بنائیں گے جس سے اقبال کے کسی شعر، کسی نظم یا کسی خیال کی ترجمانی نہ ہوتی ہو جس کے نتیجہ میں بہت ہی کم عرصہ میں بزم کے دفتر پر تصویروں کے انبار لگ گئے۔ ان میں ایسی تصویریں بڑی تعداد میں تھیں جنہیں "زبورِ عجم" اور "جاوید نامہ" کے فلسفیانہ تصورات کو رنگ و روغن کی زبان دی گئی تھی۔

ان تصویروں کی نمائش بھی ایک بہت بڑے مسئلے سے کم نہیں تھی۔ اس کو

حل کرنے کے لئے بزمِ اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ نے ایک نمائش کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ ان کے اعلان کے مطابق مولوی عبدالواحد اس کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔ ان کی مدد کے لئے اس میں خواجہ محمد احمد، غلام دستگیر رشید انعام اللہ خاں، نصیر الدین ہاشمی، خان بہادر سید احمد اور قادر محی الدین کو شامل کیا گیا۔ ساتھ ہی پچاس سے زائد رضا کار اور کارکن فراہم کئے گئے۔

پہلی تصویری نمائش

اس سلسلہ کی پہلی تصویری نمائش باغ عامہ کے ٹاؤن ہال سے متعلق آرٹ گیلری میں کی گئی اس کا افتتاح حیدر آباد کی مشہور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو نے کیا۔ وہ جب اپنی سیاسی مصروفیتوں کو ملتوی کر کے ٹاؤن ہال پہونچیں تو ان کا شاندار طریقہ پر استقبال کیا گیا۔ نمائش کمیٹی کے صدر عبدالواحد معینی نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

"حیدر آباد میں اقبال کی نسبت سے یہ میرا پہلا تجربہ ہے جو عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ محض ابتدا ہے ممکن ہے اس میں کچھ غلطیاں پائی جائیں جس کے لئے نمائش کمیٹی توقع کرتی ہے کہ اہلِ ملک نظر انداز کریں گے۔"

سروجنی نائیڈو نے اقبال کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ یورپ کے علاوہ لاہور میں بھی کئی مرتبہ ملاقات کی تھی۔ ان کی نظروں میں وہ زمانہ گھوم گیا جب ان کے وقت کا بڑا حصہ اقبال کی محفلوں میں گذرتا تھا وہ شدتِ جذبات سے بے قابو ہو گئیں اور نمائش کے افتتاح کے بعد کسی قسم کے اظہار خیال سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"میں خود کو اس بات کا اہل نہیں پاتی ہوں کہ اقبال کے نظریۂ آرٹ کے ساتھ ساتھ مصوری کے بارے میں بھی کچھ کہوں لہٰذا میرا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا:

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

اس نمائش کے بارے میں روزنامہ 'میزان' نے لکھا ہے۔

"یہ تمام تصویریں حیدرآباد کے فن کاروں کی ذہنی صلاحیتوں کے کمال فن کا نتیجہ ہیں۔ ان تصاویر میں خصوصاً پیر رومی اور مرید ہندی میں بلا کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے معراج کمال نے بنایا ہے۔ اس تصویر کے علاوہ مرد مومن کا کردار بھی عوام کو بہت پسند آیا۔"

حیدرآباد کے مصوّر

اس نمائش میں دکن کے حسن کاروں اور مصوروں کی تصویروں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ ان افراد کی بھی تصویریں خاصے اہتمام سے رکھی گئی تھیں جن کا اقبال سے براہ راست تعلق تھا یا جن پر اقبال کی کہی ہوئی نظمیں موجود تھیں۔ اس نمائش سے ہزاروں افراد نے دلچسپی لی اور متعدد روزناموں نے تعریفی شذرے لکھے، ایک اخباری رپورٹ کے مطابق

"سامنے کی دیوار کے حریری پردے پر علامہ اقبال کی بہت بڑی تصویر آویزاں کی گئی ہے جو آرٹ گیلری میں آنے والے آخری شخص تک کو اپنے رعب اور باوقار حسن کاری کی طرف خود بخود متوجہ کر لیتی ہے۔ آرٹ گیلری میں علامہ اقبال کے کئی شعر تصویروں کی شکل میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس تصویر خانہ میں پہنچ کر ہر شخص

تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ایسے ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے
جہاں اقبال کی شاعری سرمایہ زندگی بن کر دعوتِ عمل دینے لگتی ہے"

یہ تصویریں مغل تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تھیں۔ ان کے رنگوں میں اسلامی ہند کا سیاسی، قومی اور ملی شعور سانس لیتا تھا۔ ان کے قول عام کے پیشِ نظر بزم اقبال نے ریاست کے مختلف شہروں میں ان کی نمائش کی۔ اس کے علاوہ بمبئی، مدراس اور میسور کی آرٹ گیلریوں میں بھی رکھا اور ہندوستان کے لاکھوں افراد کو اس اعتراف پر مجبور کر دیا کہ یہ نمائش اقبال شناسی کی تاریخ کا سب سے اہم اور خوشگوار موڑ ہے۔ یہ نمائش بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ نے اپنی خاص نگرانی میں منعقد کرائی تھی اور تصاویر اور نقشوں وغیرہ کو خود پسند کر کے نمائش میں لگوا دیئے تھے۔

حسن یار جنگ کی صدارتی تقریر

بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ نے اپنی ایک صدارتی تقریر میں اس نمائش کی تفصیل اِن الفاظ میں بیان کی ہے۔

"یہ نمائش تمام ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی نمائش ہے۔ علامہ اقبال اور ان کے خیالات سے متعلق جس قدر مواد یکجا فراہم کیا گیا ہے اس سے پہلے کبھی فراہم نہیں کیا گیا۔ علامہ اقبال کے اصلی خطوط کے فوٹو اور کچھ خطوط کی نقلیں بڑی محنت سے حاصل کی گئیں۔ علامہ اقبال کی جملہ تصانیف، علامہ اقبال اور ان کے کلام سے متعلق بہت سی تصانیف جن سے علامہ نے استفادہ کیا تھا، ایک اچھی تعداد میں جمع کی گئیں تاکہ شائقین کلام اقبال ان سے

مستفید ہو سکیں۔ علامہ کے مشہور اشعار کے دیدہ زیب کتبے تیار کرائے گئے۔

نمائش کا سب سے زیادہ دلچسپ حصّہ وہ ہے جس میں علامہ اقبال کے اشعار و خیالات کو تصویروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ خاص ہستیاں جن کے بارے میں علامہ نے نظمیں لکھی ہیں ان میں سے اکثر کی تصویریں متعلقہ نظموں کے ساتھ پیش کی گئیں ہیں جن میں جلالتہ الملک اعلیٰ حضرت بندگانِ اقدس کی شبیہہ مبارک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس نمائش کے لئے اسلامیہ کالج مدراس کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالحق سے چودہ تصویریں منگوائی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف نقشہ جات اور علامہ اقبال سے متعلق مختلف اشیاء بھی فراہم کی گئی ہیں۔ باوجود اس نمائش کی کامیاب تکمیل کے میں کہوں گا کہ یہ نقش اول ہے جیسا ہمارا خیال تھا اس نمائش کا مکمل نہیں کیا گیا۔

میں اس نمائش کی کامیابی کے سلسلہ میں سب سے پہلے مولوی سید عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات سرکار عالی اور مسٹر اکبر وفاقانی کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں جو نمائش کمیٹی کے صدر ہیں۔ مدرسہ فنون لطیفہ کے پرنسپل خان بہادر سید احمد کا بھی خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے تصاویر، کتبوں، نقشوں وغیرہ جملہ اہم ترین کام اپنے ذمے لیا۔"

صغرا ربابی اور اقبال

اس نمائش نے بیرون حیدر آباد کے حسن کاروں پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کسی شاعر کے کلام کو مصور کر کے کوئی تحریک چلائی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اپنی سوچ کا زاویہ بند نہیں کیا اور اپنے پندار کے گھروندوں سے نکل کر آئینۂ ایام میں اپنی ادا دیکھی اور مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کا نظارہ کیا۔ پاکستان کی نامور مصوّر خاتون صغرا ربابی کا فن اس وقت ابتدائی مراحل سے گذر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اگر انہوں نے زمانے کے تقاضوں پر توجہ نہیں دی تو حقیقت پسندی کا شعور ان کو چھوڑ کر نکل جائے گا چنانچہ انہوں نے چند مہینے کی کوشش کے بعد اقبال کی مختلف نظموں کو موضوع بنا کر کئی تصویریں بنائیں اور کئی شعروں کو رنگ و روغن کے ذریعہ کینوس پر منتقل کیا۔ جب یہ تصویریں خاصی تعداد میں ہوگئیں تو ان کی نمائش کے لئے حیدر آباد آگئیں۔

بزم اقبال نے صغرا ربابی کی شایان شان پذیرائی کی اور اپریل ۴۵ء میں راجہ پرتاب گرجی کی کوٹھی میں ان کی تصویروں کی نمائش کا اہتمام کیا اور ریاست حیدر آباد کے صدر اعظم نواب احمد سعید چھتاری سے درخواست کی کہ وہ اس نمائش کا افتتاح فرمائیں۔ نواب چھتاری نے اقبال کو بڑے قریب سے دیکھا تھا اور ان کے افکار و نظریات سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے بزم اقبال کی یہ درخواست بخوشی قبول کر لی۔ صغرا ربابی کی تصویروں پر تجریدیت غالب تھی اور اس کو ہندوستان کے مصوروں نے اپنایا بھی نہیں تھا۔ اس لئے یہ تصویریں اپنی انفرادیت کی وجہ سے بہت پسند کی گئیں۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق اس نمائش میں صغرا ربابی کی بیس ہزار روپیہ سے زائد رقم کی تصویریں فروخت

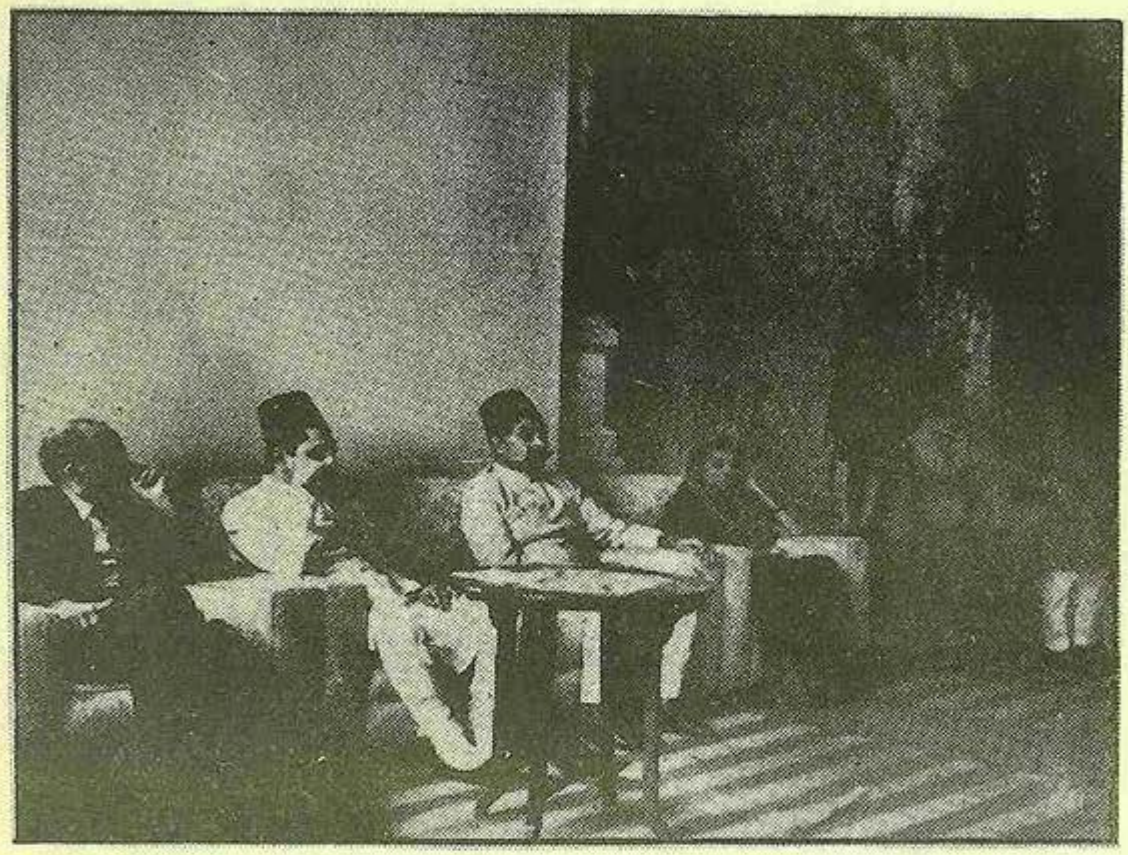

۲۶ ستمبر کو پاکستان کی مشہور مصور خاتون صغرا ربابی کی تصاویر کی نمائش پر لی گئی تصویر (دائیں سے بائیں) صغرا ربابی، نواب سعید احمد چھتاری، نواب حسن یار جنگ، زاہد حسین وزیر مالیات، نظر آرہے ہیں۔ یہ نمائش حیدر آباد میں راجہ پرتاب گیر جی کی کوٹھی میں منعقد ہوئی تھی۔

ہوئیں جن کو لوگوں نے بڑے چاؤ سے اپنے ایوانوں میں سجایا۔

رائچور میں تصویری نمائش

اس کے ایک سال بعد ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد سے کئی میل دور رائچور کے مقام پر ایک ایسی نمائش منعقد کی گئی جس کے لئے حیدرآباد ہی کے حسن کاروں کی بنائی ہوئی تصویروں کا انتخاب کیا گیا۔ اس نمائش میں تصویروں کے علاوہ طغرے بھی رکھے گئے تھے اور ایک گوشہ میں اقبال اور اُن سے متعلق تصانیف کو جگہ دی گئی تھی۔ اس نمائش کی ترتیب و تزئین میں محمد اکبر وفاقانی نے حصہ لیا تھا اور اس سلسلے میں منظور الحسن رضوی، اعجاز علی خاں اور شیخ محمود نے مدد کی تھی۔ جب نواب حسن یار جنگ، بزم اقبال کے صدر کی حیثیت سے رائچور پہونچے تو شہر کے معززین نے ان سے افتتاح کی درخواست کی۔ ان کے افتتاح سے پہلے جشن اقبال کے صدر استقبالیہ مولوی سید زین العابدین نے شاندار لفظوں میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

"نواب حسن یار جنگ کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اپنے علمی اور ادبی ذوق کی وجہ سے تمام ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے کلام و پیام کو بیرون ہند میں عام کرنے کے لئے جو کوششیں کی ہیں ان سے انکار ممکن نہیں، یہ ان ہی کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انگلستان میں اقبال میموریل سوسائٹی اور اقبال اسٹیڈی گروپ قائم ہو چکے ہیں۔"

نواب حسن یار جنگ نے اپنی جوابی تقریر میں بزم اقبال شاخ رائچور کے عہدہ داروں کے خلوص و عمل کی تعریف کی اور کہا کہ:

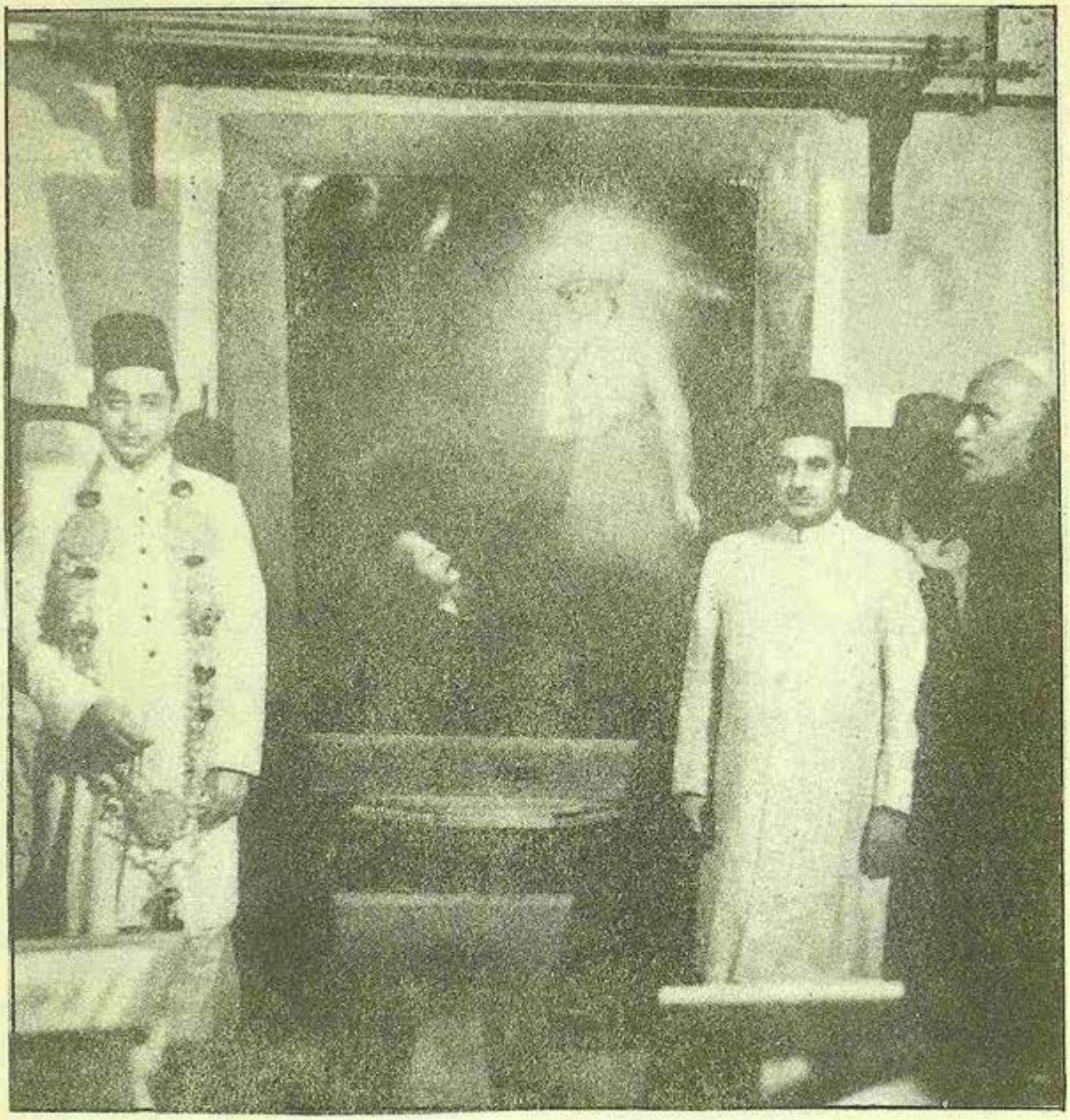

"علامہ اقبال کا مولانا روم کی روح سے خطاب"۔ یہ تصویر مرکزی بزم اقبال کی جانب سے ضلع رائچور میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔ اس تصویر میں ایک طرف نواب حسن یار جنگ اور دوسری طرف زین العابدین اول تعلقہ دار اور احمد حسین امجد نظر آرہے ہیں ۱۹۴۵ء

"میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے افکارِ اقبال کو عام کرنے کا فیصلہ جس مقصد سے کیا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ملک کے نوجوانوں میں سیاسی اور ملّی بیداری پیدا ہو۔ اگر وہ سیاسی اور ملی طور پر بیدار نہیں ہوں گے تو مستقبل ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

رائچور کرناٹک کا مختصر سا شہر ہے۔ اس کی آبادی تیس چالیس ہزار سے زائد نہیں تھی اس کے باوجود اطراف وکناف کے رہنے والے اس نمائش کو دیکھنے کے لئے اتنی تعداد میں آ گئے تھے کہ یہ ہزاروں کا شہر لاکھوں کا معلوم ہوتا تھا۔ جب مشہور شاعرہ سیدہ اختر کو اس نمائش کی تصویریں دکھائی گئیں اور ان کے متعلق بتایا گیا تو وہ دنگ رہ گئیں اور ایک اخباری نامہ نگار کو بتایا کہ نئی نسل کے علاوہ اقبال کے کلام کا صحیح محافظ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

۱۹۴۷ء کے آغاز میں حیدرآباد کئی سیاسی تحریکوں سے دوچار تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈروں کی تقریریں اور بیانات ـــــ اس کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر پوری طرح اثر انداز ہو رہے تھے اس کے لئے اپنی آزادی کے تحفظ کا مسئلہ بھی بڑا نازک اور اہم بن گیا تھا۔ ایسی جانگسل کشاکش کے زمانے میں بھی، حیدرآباد اور اہلِ حیدرآباد نے یقین وعزم کے قندیل روشن رکھے اور اقبال اور متعلقاتِ اقبال کی تصاویر سے تصویر خانے اس طرح سجائے کہ سمند ناز پہ اِک اور تازیانہ ہوا۔

اس نمائش کے لئے حیدرآباد کے ایک ہی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یہ مصور تھا عبدالقیوم ـــــ حیدرآباد میں اس کے بے شمار

شاگرد تھے۔ اس کی تصویریں اسلامی اسلوب، مغلیہ کلچر اور ایرانی رجحانات کی نمائندہ تھیں۔ ان کے دیکھنے سے لوگوں میں خون کے بجائے برق پارے دوڑتے محسوس ہوتے تھے' ان تصویروں کو ہزاروں لوگوں نے دیکھا اور دل کھول کر کمال فن کی داد دی اور خاص طور سے دو تصویروں "رومی اور اقبال"، "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"۔ کو سب ہی نے پسند کیا۔

چغتائی اور حسن یار جنگ

صدر بزم اقبال نواب حسن یار جنگ ان نمائشوں کو آغاز کار سے زیادہ درجہ نہیں دیتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے تمام مشہور مصوروں کو بزم اقبال سے تعاون کے لئے آمادہ کیا جائے اس سلسلہ میں انہوں نے کلکتہ کے نگار خانے بھی دیکھے۔ بمبئی کے جے جے آرٹ اسکول کا بھی معائنہ کیا۔ مدراس کے اسکول آف آرٹ کے اساتذہ سے بھی مدد لی۔ زیادہ امید افزا نتائج برآمد نہیں ہوئے تو لاہور جا کر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی سے ملاقات کی جو محلہ چابک سواراں میں رہتے تھے۔ انہوں نے اقبال کے ایک تصویری مرقع کے پیش لفظ میں اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جب مجھے تصویروں کے ایک دیدہ زیب مرقع کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ کہا گیا کہ اس میں ملک کے کسی مشہور مصور کی فن کاری کے نمونے ضرور شریک ہوں تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ مقبول ہو سکے۔ ظاہر ہے اس کام کے لئے بہزاد ہند خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی سے بہتر اور کون مصور ہو سکتا ہے۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں جب میں لاہور گیا تو میں نے چغتائی صاحب سے خاص طور سے ملاقات کی اور ان سے

اس مرقع کے لئے علامہ اقبال کے کلام پر چند تصویریں تیار کرنے کی خواہش کی۔ چغتائی صاحب نے میری اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے تصویروں کی تیاری کا وعدہ فرمایا۔ مجھے حیرت ہے کہ خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی نے ایک مختصر مدت میں اس کو عملی جامہ پہنایا اور آج ہم ملک میں ان اہم تصاویر کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہیں۔"

چغتائی صاحب عرصہ دراز سے اقبال کے تصورِ 'مردِ مومن' پر غور کر رہے تھے ان کے ذہن میں برصغیر کی کئی ممتاز شخصیتوں کے خدوخال ابھر رہے تھے۔ نورجہاں جہانگیر، عالمگیر، ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی اور اسی طرح کی دوسری شخصیتیں نواب حسن یار جنگ کی تجویز نے ان کے غور و فکر کو مہمیز کیا، رنگ و روغن کینوس پر مختلف شکلیں اختیار کر گئے۔ قلم اور برش نے مسلمانوں کی تہذیبی قدروں کو نمایاں کیا۔ اقبال کے کلام کی جمالیاتی معنویت ایک دو نہیں سڑسٹھ تصویروں کی شکل میں سامنے آگئی۔ چغتائی صاحب نے بہت ہی مختصر عرصہ میں اقبال سے متعلقہ ۶۷ تصویریں نواب حسن یار جنگ کو بھجوائیں۔ اس کے فوری بعد نواب صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے جشنِ اقبال کے موقع پر ایک نمائش کے ذریعہ عوام کے سامنے پیش کریں گے ـــــ ساتھ ہی انہوں نے چغتائی صاحب سے بھی درخواست کی کہ وہ اِس نمائش میں حیدرآباد آکر شریک ہوں۔

چغتائی کی نمائش

چغتائی صاحب کی تصویروں کی نمائش کوئی معمولی نمائش نہیں تھی۔ اس کے دیکھنے کے لئے ہزاروں تماشائی دیوانہ وار ٹوٹ پڑے تھے، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تماشائیوں کا یہ سیل ایک ایسا لامتناہی سلسلہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا ـــــ

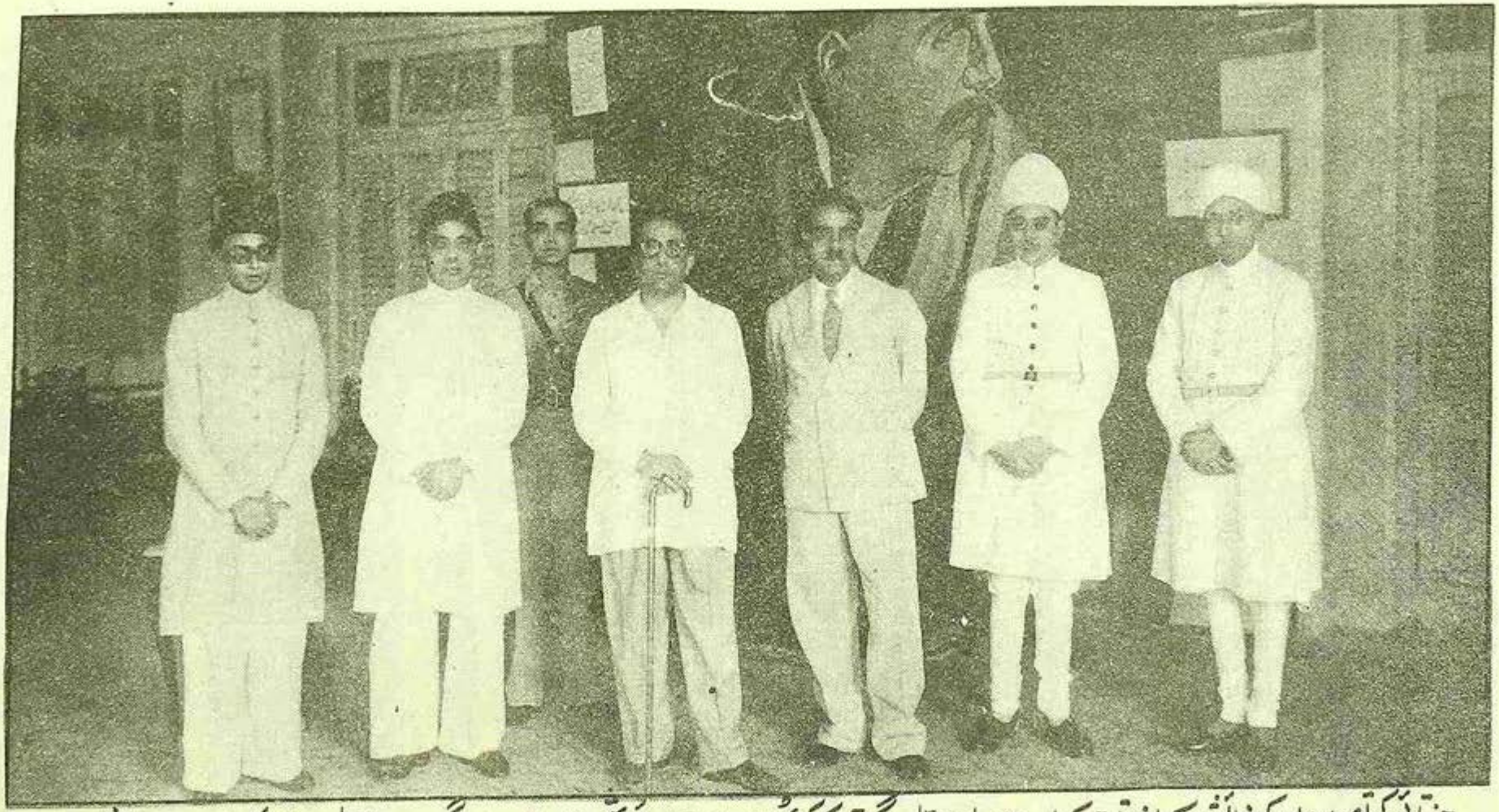

چغتائی کی تصویروں کی نمائش کے افتتاح کے بعد، جو راجہ پرتاب گیرجی کی کوٹھی میں منعقد ہوئی تھی، نواب حسن یار جنگ، عبدالرحمٰن چغتائی، ولیعہد بہادر اعظم جاہ راجہ محبوب کرن اور معین الدین کولاس کا گروپ فوٹو۔

چغتائی صاحب کی عادت تھی کہ وہ کبھی اپنے آپ کو یہ ظاہر کر کے خوش نہیں ہوتے تھے کہ وہ آرٹسٹ یا مصوّر ہیں، یا وہی ہیں جس نے دیوانِ غالب اور رباعیات عمر خیام کو مصور کیا ہے۔ ان کو اپنی شخصیت پر عام آدمی کا لبادہ ڈالے رکھنے میں مسرّت محسوس ہوتی تھی۔ ادھر تماشائیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اس نمائش کی تصویروں کے ساتھ ان کے خالق کو بھی ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ تماشائیوں کے اس فرطِ اشتیاق نے بالآخر نواب حسن یار جنگ کو مجبور کیا کہ وہ نمائش کے دوران ہی چغتائی صاحب کے ساتھ ایک شام منانے کا اعلان کریں۔

یہ تقریب نمائش گاہ کے ایک وسیع و عریض ہال میں راجہ محبوب کرن آصف جاہی کے زیرِ صدارت منعقد کی گئی۔ مرکزی بزمِ اقبال کے سکریٹری معین الدین کولاس نے چغتائی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا:

"میں چغتائی صاحب کو ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ آج سے ڈیڑھ سال پہلے سر عبدالقادر کی ٹمپل روڈ والی قیام گاہ پر نواب حسن یار جنگ کے ساتھ ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مرکزی بزم اقبال خوش قسمت ہے کہ وہ اقبال کی تمناؤں کو لئے ہوئے حیدر آباد تشریف لائے ہیں اور اس نمائش میں اپنی ۶۷ تصاویر پیش کی ہیں جن میں سے ساٹھ تصویریں تو ایسی ہیں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے، البتہ سات تصویروں سے صرف اہل نظر ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ان تصویروں کا اصل عنوان مردِ مومن ہے۔ ان میں ابھی اور بھی اضافے ہوں گے۔ چغتائی صاحب کی یہ تصویریں ایک غیر فانی سرمایہ ہیں۔ اقبال کے تصورات کو ان تصویروں میں پاکر دنیا بڑے جتن سے ان کی حفاظت کرے گی۔"

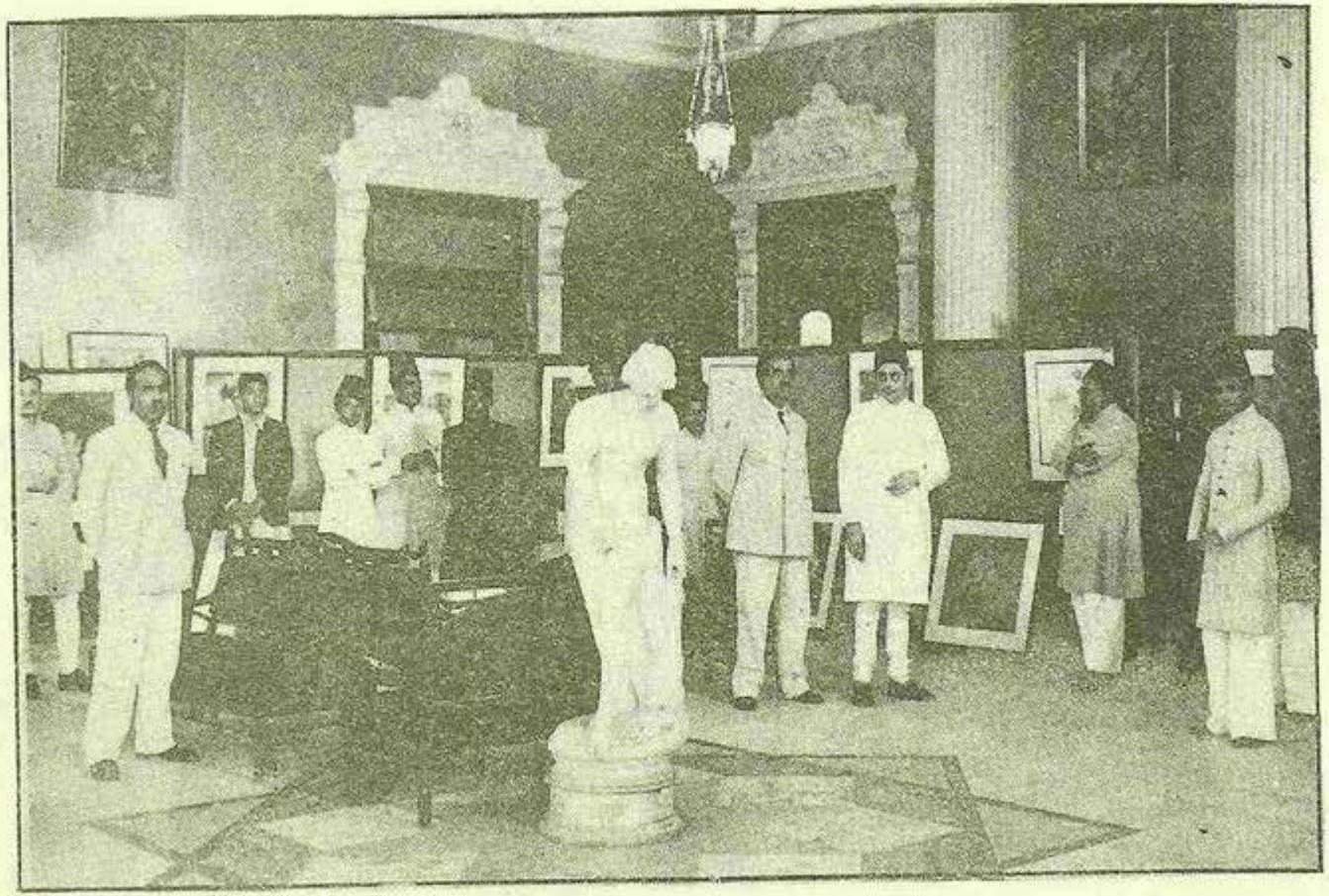

۲۱، اپریل ۴۸ء کو عبدالرحمٰن چغتائی کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش میں نواب حسن یار جنگ، عبدالرحمٰن چغتائی کے ہمراہ تصویریں دیکھ رہے ہیں۔

اس خیر مقدمی تقریر کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے پروفیسر مرزا حسن علی، خلیق احمد نعمانی اور صدر المہام طبابت ہلکار جن نے ایرانی حسن کاری چغتائی کا آرٹ اور چغتائی کا نظریہ فن کے عنوان سے مقالے پڑھے۔ اکبر وفاقانی نے "چغتائی" پر نظم سنائی۔ نمائش کمیٹی کے صدر خواجہ محمد احمد نے چغتائی صاحب کے کام کی تفصیل بتائی، انہوں نے کہا

"میں اس نمائش کو جسے قرآن السعدین کہا جاسکتا ہے، ایک زبردست تحریک کی تمہید سمجھتا ہوں، میں کسی راز کو افشا نہیں کر رہا ہوں۔ اگر یہ کہوں کہ ہمارے بلند ہمت صدر یعنی نواب حسن یار جنگ اور پختہ قلم مصور یعنی خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی اس فکر میں ہیں کہ ایک خاص کمیٹی کے انتخاب کردہ اقبال کے اشعار کو مصور شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ان کی تیاری میں چغتائی صاحب اپنی پوری توانائیوں، کو روبہ عمل لائیں گے اور وہ چغتائی صاحب کے بہترین شاہکار ہوں گے یہ مرقع 'مردِ مومن' کے نام سے رونما ہوگا۔ تجویز یہ ہے کہ اس کی طباعت، بلاک سازی اور جلد سازی کا کام امریکہ میں انجام پائے اور وہ مسلمانوں کے ثقافتی ورثے کے نمونہ کی حیثیت سے دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں رکھا جائے"۔

جب خواجہ محمد احمد نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے چغتائی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے نظریہ فن پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ انہوں نے ان تصویروں کی تیاری میں اس قدر زیادہ دلچسپی کیوں لی اور ان کو افسانہ نگاری سے مصوری کے میدان کے آنے تک کن ذہنی مراحل سے گزرنا پڑا۔ چغتائی صاحب کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کے سامنے اظہارِ خیال کے لئے اتنا بڑا موضوع

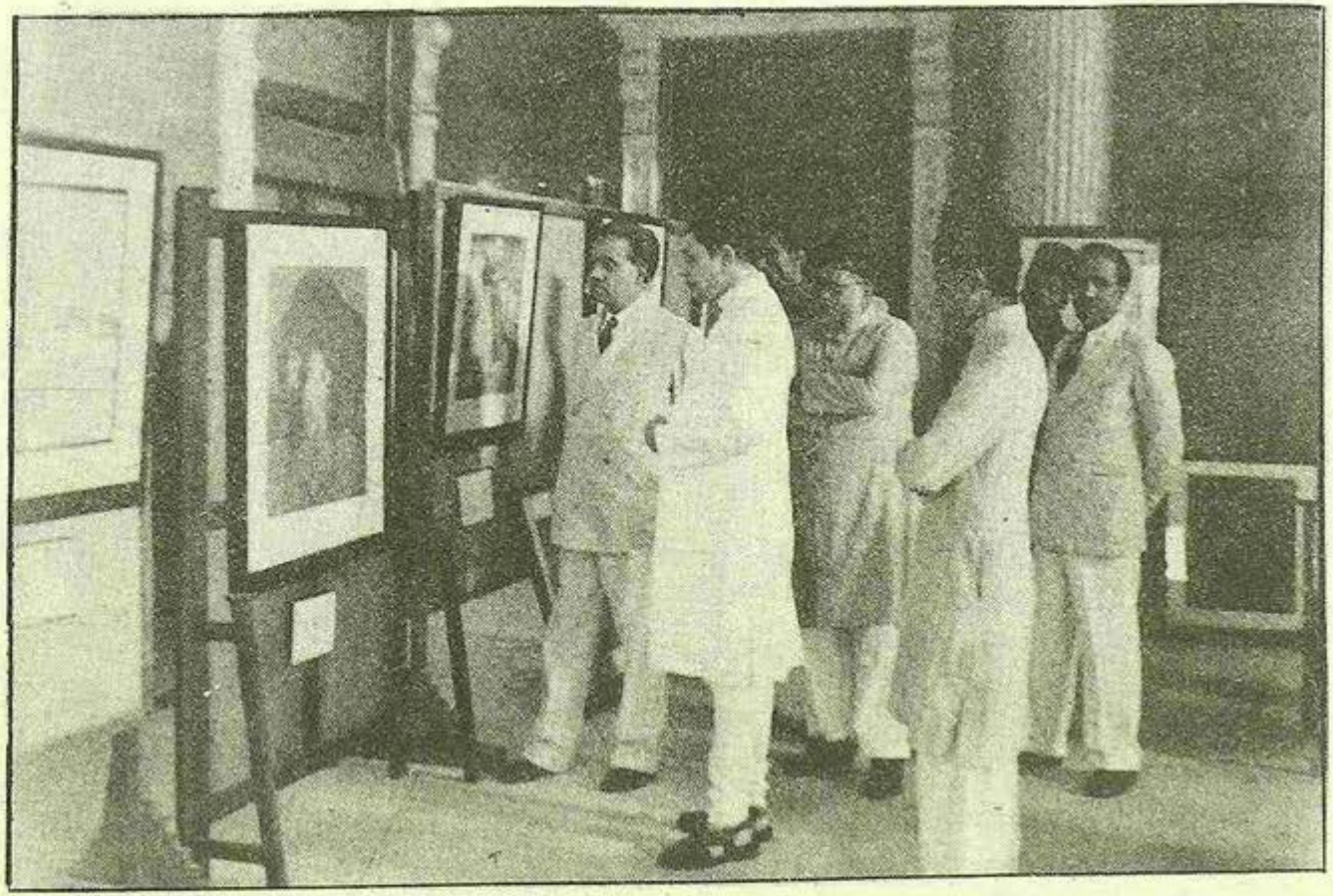

اقبال سے متعلق عبدالرحمٰن چغتائی کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش، مرکزی بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ اور ان کے رفقا "مرقع اقبال" کی اشاعت کے لئے نمائش میں رکھی ہوئی تصویروں میں سے چند کا انتخاب کر رہے ہیں۔

جو کئی سالوں پر محیط تھا رکھا جائے گا۔

ان کے ذہن میں اس دور کی پوری تاریخ گھوم گئی جس میں انہوں نے ہوش سنبھالا تھا اور افسانہ نگاروں سے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر تاثیر کے قصّے، سالک کی باتیں، سر عبدالقادر کے واقعات اور حکیم یوسف حسین کے تذکرے سب یاد آ گئے۔ یہ بھی یاد آیا کہ انہوں نے اقبال کو پہلی مرتبہ انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں شذرہ سناتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے کہا۔

"جن دنوں اقبال سے میری ملاقات ہوئی تھی، وہ انارکلی والی بیٹھک میں رہتے تھے اور فارسی کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ جب میں جاتا تھا تو کوئی نہ کوئی نظم سنانے پر تیار ہو جاتے تھے۔ میں نے اپنی عادت کیمطابق پہلے ہی ان کو کہہ دیا تھا کہ میں فارسی بالکل نہیں جانتا۔ پھر وہ شعر پڑھتے تھے، مجھے ایک ایک شعر کا مطلب سمجھاتے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ اس نظم کا کون سا حصہ تصویر دار ہو سکتا ہے۔ میں نے ان کی نظم 'میلادِ آدم' پر کئی خاکے بنائے۔ مثلاً آدم اکیلا بہشت سے اُگتا گیا ہے یا آدم و حوا جنت کی وسعتوں میں کھوئے کھوئے معلوم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تصویر بجھی ہوئی شمع (سوزِ ناتمام) میں نے ان ہی کی ایماء پر بنائی تھی اور تصویر میں کتابِ حکمت کی آیاتِ پاک بھی انہوں نے قبر پر لکھنے کی تجویز پیش فرمائی تھی۔"

چغتائی صاحب کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کے دولتکدے پر اکثر حاضری دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اس عظیم المرتبت شاعر کی کوئی خدمت، کر سکیں تاکہ آنے والی نسل ان پر طعن زن نہ ہو کہ انہوں نے اپنے ایک بہت بڑے ہمعصر سے عدم التفات کا رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے کہا۔

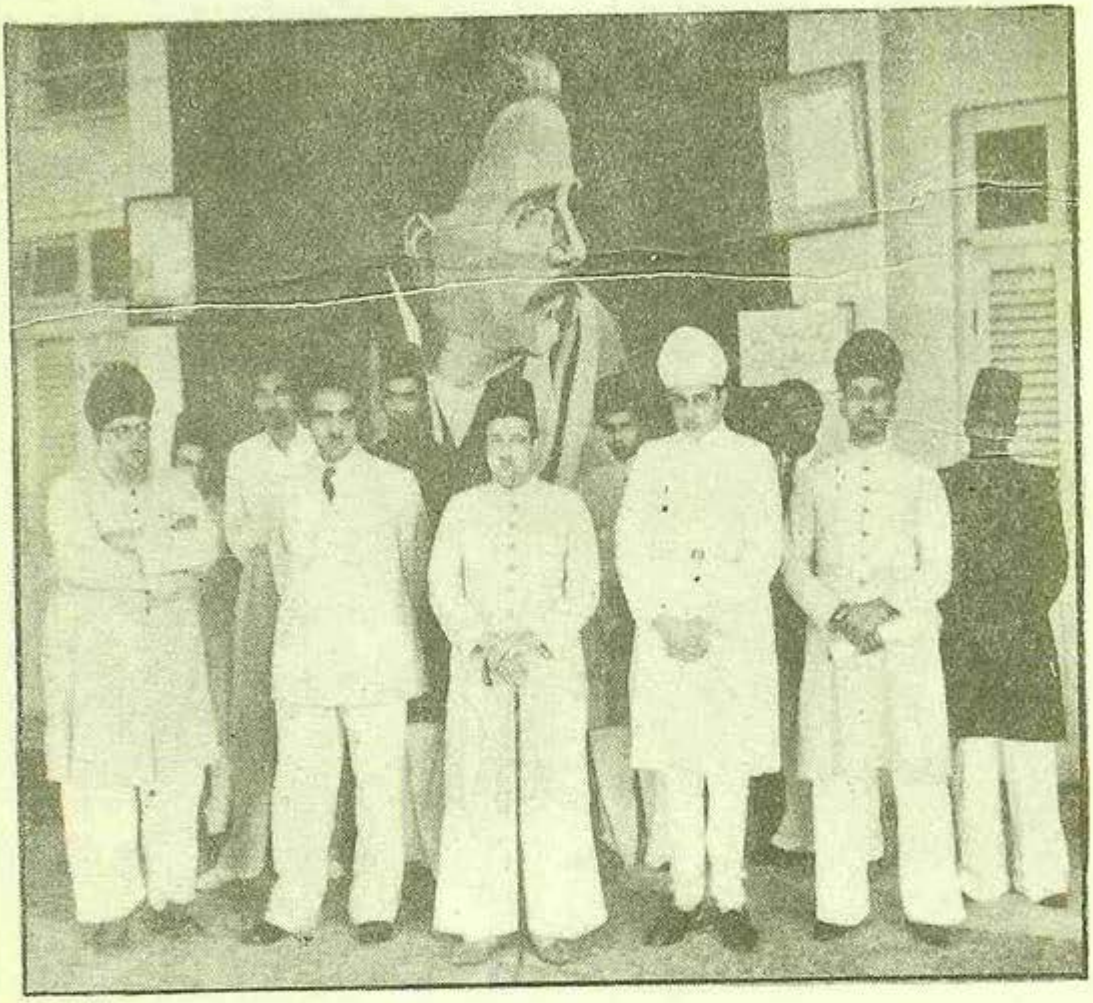

۲۶ر اپریل ۴۸ء کو چغتائی کی اقبال سے متعلق تصویری نمائش میں نظام دکن کے بھائی نواب بسالت جاہ بہادر عبدالرحمٰن چغتائی اور صدر بزم اقبال نواب حسن یار جنگ کے ساتھ۔

"اقبال کی وفات سے ایک روز قبل میں اِن کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان دیر تک جاوید نامہ کے تصویری ایڈیشن پر گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی کسی ایک کتاب کے تصویر دار شائع ہونے کا شوق ضرور تھا اور اس شوق کی بنا پر کبھی ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے مجھے خط لکھ کر بلا لیا یا علی بخش کو بھیج دیا اور تصویر دار کتاب شائع کرنے کے بارے میں تین تین بجے رات تک مشورہ کرتے رہے۔"

مرکزی بزم اقبال بہت بڑے پیمانے پر چغتائی صاحب کی تصویریں چھاپنا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں اس نے ایک بہت بڑا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ اس منصوبہ سے اتفاق کرتے ہوئے چغتائی صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ:

"ڈاکٹر صاحب کی مصور کتاب کے بارے میں میری آخری تجویز یہ ہے کہ اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو قبلہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سو سوا سو شعروں کا انتخاب رباعیات عمر خیام کی طرح ترتیب دیکر مرد مومن کے عنوان سے شائع کروں اس کے بعد جو تجویز میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ محافظان حقوق اور اصول کاپی رائٹ کے مالکوں کو چاہیئے کہ کتاب مرد مومن ہو یا جو کتاب ہو وہ خود تجویز فرمائیں۔ میں اس کے لئے تمام تصویریں مہیا کروں گا۔ اس کے نقش و نگار اور حاشیہ تیار کروں گا۔ کتاب کا غذ پسند کروں گا۔ کاتب سے لکھوائی اور بلاک کی نگرانی کروں گا۔ پھر کتاب اپنی نگرانی میں چھپواؤں گا۔ بعد ازاں اس کا صلہ صرف یہ ہوگا کہ اپنی ذات کے لئے ایک کاپی لوں گا اور اس کی مقررہ قیمت بغیر کمیشن کاٹے ادا کروں گا۔ یہ ہے ایک آخری

۳ مئی ۱۹۴۰ء کو اقبال سے متعلق عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویری نمائش کا ریاست حیدر آباد کے ولیعہد اعظم جاہ بہادر نے معائنہ کیا اور چالیس ہزار روپے سے زائد کی تصویریں خرید فرمائیں۔

خدمت جو انجام دے سکتا ہوں"۔

آخر میں تقریب کے صدر راجہ محبوب کرن آصف جاہی نے چغتائی صاحب کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ :

"چغتائی صاحب کی نمائش کو چار لاکھ سے زائد افراد نے دیکھا اور فلسفی مصور کے کمال فن سے واقفیت حاصل کی۔ حضرات! مرکزی بزم اقبال کو حکومت کی امداد حاصل ہے نہ اس کا کاروبار چندوں کا مرہون ہے۔ ایک صاحب فن کی بجا طور پر قدر دانی کر رہی ہے میں حکومت اور امیروں سے تعلق رکھتا ہوں کہ وہ خاص دلچسپی لے کر چغتائی صاحب کی ایسی قدر دانی کریں کہ حسن کاری کی تاریخ میں یادگار رہے"۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال کے کلام پر عبدالرحمٰن چغتائی کی نمائش کا افتتاح ولیعہد سلطنتِ آصفیہ نواب اعظم جاہ نے فرمایا۔ نواب حسن یار جنگ نے نواب اعظم جاہ بہادر سے چغتائی صاحب کا تعارف کرایا۔ اس نمائش کا نہ صرف ریاست کے تمام عمائدین و امراء و عہدیداروں نے دیکھا بلکہ اس نمائش کا چرچا سنکر بہت سے بیرون ملک کے فنکاروں اور عوام نے دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست میں سیاسی بحران سر پر منڈلا رہے تھے مگر ایسی شورشی حالت میں بھی نواب حسن یار جنگ کی حسنِ تدبّر کی وجہ سے یہ نمائش نہایت کامیاب ہوئی حکومت حیدرآباد نے اور امراء و عمادینِ سلطنت نے مسٹر چغتائی کی ہمت افزائی کے لئے ایک لاکھ روپے سے زیادہ قیمت کی تصویریں خریدیں۔

چھٹا باب

اقبال بیرون حیدر آباد میں

۲۱ اپریل ۳۸ء کو اقبال نے انتقال کیا۔ اس کے اگلے روز یعنی ۲۲ اپریل کو سکندر آباد کی جمعیت مسلم نونہالان نے بہت بڑے پیمانے پر ایک تعزیتی جلسہ کی تیاریاں کیں۔ یہ جلسہ رات کے آٹھ بجے مولوی یوسف خاں کی صدارت میں ہوا جس میں شہر کے سربرآوردہ شخصیتوں نے اقبال کی جناب میں عقیدت کے پھول پیش کئے۔ مولوی حسام الدین غوری نے "مجاہد اقبال" کے عنوان سے اپنی تعزیتی تقریر میں کہا۔

"یہ جلسہ اقبال کی وفات پر اظہار تعزیت کے لئے منعقد ہوا، اس لئے یہ موقع نہیں ہے کہ ہم دھواں دھار تقریریں کریں۔ ہندوستان اور خصوصاً دنیائے اسلام کے لئے شاعر مشرق کی جدائی ایک سانحہ عظیم ہے اور حزن و ملال کی شدت سے قوتِ گویائی کا سلب ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ اس لئے آج میں کوئی طویل تقریر کرنے سے قاصر ہوں۔

اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں جہاد کی تعلیم دی ہے۔ مسلم وہی ہے جو مجاہد ہے اور اس کا اچھا نمونہ اقبال اور اس کا عمل ہے۔ چنانچہ جس وقت اقبال کی روح پرواز کر رہی تھی، اس وقت بھی اس کی زبان پر وہی مجاہدانہ جوش سے بھرے ہوئے الفاظ تھے۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی سے موت کا استقبال کرتا ہوں"۔

اقبال کا کلام الہامی کلام ہے اور اس کے ہر ہر لفظ میں مجاہدانہ روش اور تڑپ موجود ہے۔ اقبال کی نظر میں انسان کے لئے مرجانا آسان ہے لیکن کچھ کر جانا بہت مشکل ہے۔ اقبال کا کلام مسلمانوں کو مرجانے کی تعلیم نہیں دیتا۔ گو آج اقبال ہم سے جدا ہو گیا ہے لیکن اس کا پیام اب بھی موجود ہے۔ وہ ترقی کی طرف رہ نمائی کر رہا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے قلب کی گہرائیوں میں وہ جوش اور تڑپ پیدا کریں جو اقبال کے کلام میں موجود ہے۔"

مولوی حسام الدین غوری کے بعد، سید خواجہ برہان اللہ نے زندگی کے متعلق اقبال کے مختلف نظریات کا تذکرہ کیا اور اسلامی تعلیمات پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"اقبال کا کلام تعلیماتِ قرآنی کا حامل ہے اور اس کا ہر لفظ ہمارے قلب کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ اقبال ہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے ہندی مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور مسلم نوجوانوں میں عمل کی تڑپ پیدا کردی اور شاعری کو پیغمبری کا جزو بنا دیا۔"

سید خواجہ برہان اللہ کے بعد جناب فیاض علی بیگ نے اقبال کے فن و شخصیت کے بارے میں ایک مقالہ پڑھا۔ مقالہ کے اختتام پر صدر جلسہ مولوی یوسف خاں نے حسب ذیل قرارداد پڑھ کر سنائی جس کو حاضرین نے کھڑے ہو کر منظور کر لیا۔

"علامہ اقبال کی وفات حسرت آیات ہندوستان اور خصوصاً دنیائے اسلام کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ ہم جمیع اراکین مسلم نونہالان، سکندر آباد مرحوم کی یوں بے وقت وفات پر انتہائی غم واندوہ کا اظہار کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ اقبال نے اپنے الہامی کلام سے دنیائے اسلام کے ہاتھ میں خودی کی مشعل دیدی جو ماضی کی گھنگور گھٹاؤں میں

گھری ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں اس کی بے خودی، خودی سے بدل گئی۔ گو اقبال اس وقت ہم میں موجود نہیں لیکن ان کے کلام سے دنیائے اسلام کی روح تازہ ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اگر اقبال کو اسلام کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔[1]"

یہ حیدرآباد اور اہلِ حیدرآباد کی جانب سے اقبال کی وفات پر پہلا تعزیتی جلسہ تھا اس جلسہ کے بعد ہی حیدرآباد کی کئی انجمنوں، سوسائیٹیوں اور علمی اور ادبی اداروں نے مختلف مقامات اور شہروں میں تعزیتی جلسہ کئے اور اپنے محبوب شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

بہادر یار جنگ کا اشکِ عقیدت

جس روز جمعیت مسلم نوجوانان سکندرآباد کا تعزیتی جلسہ ہو رہا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ اپنے جاگیری علاقے سے انتہائی عجلت میں حیدرآباد لوٹے تھے۔ وہ ابھی ریلوے اسٹیشن ہی پر تھے کہ ان کو اقبال کی وفات کی اندوہناک خبر ملی۔ انہوں نے ریلوے اسٹیشن ہی سے اخبارات کے لئے ایک تعزیتی پیغام بھجوایا۔ چنانچہ ۲۳ اپریل ۳۸ء کو شائع ہونے والے تمام ہی اردو اور انگریزی اخباروں نے "دکن نیوز" کے حوالے سے ان کے تاثرات نمایاں طور پر شائع کئے۔ نواب بہادر یار جنگ جو فکرِ اقبال کے عدیم المثال شارح بھی تھے اپنے پیغام میں کہا تھا

"آج اپنی جاگیر سے واپس آیا تو حضرت علامہ اقبال کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح میرے خرمن دل پر گری۔ میرے لئے یہ صدمہ ان تین صدموں سے کسی طرح کم نہیں جو حضرت والد مرحوم، استاد محترم حضرت علامہ شمسؒ اور پیر و مرشد مولانا سید محمود صاحب قبلہ کے انتقال سے ہوئے تھے

[1] روزنامہ "وقت" ۲۳ اپریل ۳۸ء

اقبال کی موت نہ صرف مسلم قوم کا بلکہ مشرق اور دنیا کا ایک عظیم اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کی ندائے عمل نے ان کے لئے عنہ الناس عنہ اللہ وہ مقام رفیع پیدا کر دیا ہے کہ وہ ہماری فاتحہ اور دعا سے ہر طرح مستغنی ہیں۔ ان کا بہترین صلہ اور ان کی محبت کا تقاضا ہے کہ ہم ان کے پیغام کو مشعلِ راہ بنائیں۔ بانگ درا اور ضرب کلیم سے چونکیں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کو سمجھیں، جاوید نامہ کو حرزِ جاں بنائیں اور وہ مقام پیدا کریں جہاں اقبال ہم کو دیکھنا چاہتے تھے۔" [1]

غوری صاحب کا غنائیہ

اقبال مایوسی اور نامرادی کے شاعر نہیں تھے۔ ان کا کلام دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتا تھا جس سے سعی اور عمل کی نشو و نما ہوتی تھی چنانچہ جب رقت و کرب کا دور گذر گیا اور اہلِ حیدر آباد کے حواس اعتدال پر آئے تو انہوں نے اقبال کے کلام و پیام کو عوام تک پہنچانے اور ان کی تحریکِ عمل کو جاری و ساری رکھنے کے لئے سینکڑوں اسلوب اختیار کئے۔ اس سلسلے میں مولوی حسام الدین غوری نے اقبال کے کلام پر مشتمل غنائیوں کو اسٹیج پر پیش کیا۔ یہ غنائیے ڈراموں سے ملتے جلتے ہوتے تھے۔ ان میں ان ہی کرداروں کو منتخب کیا جاتا تھا جن کو اقبال نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ جب مسلم نوجوان سکندر آباد کی جانب سے مولوی حسام الدین غوری کا غنائیہ "اقبال" اسٹیج کیا گیا تو لوگوں نے اس سے بڑی دلچسپی لی اور پھر کئی شاعروں نے اس قسم کے غنائیوں کی ضرورت کو پوری شدت سے محسوس کیا، چنانچہ اس سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ کے استاد پروفیسر عبدالقیوم خاں باقی کا غنائیہ 'اقبال' اس سلسلہ کی بہترین مثال ہے

[1] روزنامہ وقت ۲۲ر اپریل ۱۹۳۸ء

یومِ اقبال کی تقریبات

بزمِ اقبال نے حیدرآباد کے باہر بھی مختلف شہروں میں اپنی شاخیں قائم کر رکھی ہیں اور ان شاخوں کے ذریعہ بھی اقبال کے کلام اور پیام کو عوام تک پہنچایا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے آغاز پر بزم اقبال کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سال ہفتۂ اقبال حیدرآباد کے باہر رائچور میں وہاں کی شاخ کے زیر اہتمام منائے گی۔ اس فیصلہ کے بعد بزمِ اقبال کی رائچور شاخ نے ۳۶ افراد پر مشتمل ایک مجلس استقبالیہ ترتیب دی اور اس کا صدر سید زین العابدین اول تعلقہ دار رائچور کو منتخب کیا اور ہفتۂ اقبال کی زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ ریاست اور بیرونِ ریاست کے تمام ہی اسکالروں کو دعوت نامے بھیجے گئے اور ان سے شرکت کی درخواست کی گئی۔

۱۱ مئی ۱۹۴۶ء کو بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ اپنے ساتھیوں کیساتھ رائچور پہنچے تو ارکانِ استقبالیہ نے ان کا شاندار استقبال کیا اور وہ جلوس کی شکل میں شہر کے مختلف راستوں سے پبلک گارڈن لے جائے گئے جہاں پرچم کشائی کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پرچم کشائی کی تقریب کا آغاز ریاست کے قومی ترانے سے ہوا۔ اس کے بعد نواب حسن یار جنگ نے پرچم آصفی کو بلند کرتے ہوئے حاضرین سے خطاب کیا اور کہا کہ ریاست حیدرآباد کی ڈھائی سو سالہ تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے بلا تفریق مذہب و ملت اس پرچم کو بلند رکھا ہے اور آج ہم عہد کرتے ہیں کہ جس وقت تک ہماری رگوں میں خون گردش کرتا رہے گا اس پرچم کی عظمت کو برقرار رکھیں گے۔

پرچم کشائی کی تقریب کے ختم ہونے کے کچھ دیر بعد سے بیرونی اسکالروں، ادیبوں اور شاعروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور شام تک مہمانوں کی اچھی خاصی تعداد رائچور پہنچ گئی۔

مرکزی بزم اقبال حیدرآباد نے رائچور میں جشن اقبال منایا۔ اس تصویر میں نواب حسن یار جنگ کے علاوہ بنگلور کی مشہور شاعرہ سیدہ اختر، زین العابدین اول تعلقہ دار، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، احمد حسین امجد، اکبر وفاقانی اور دوسرے شرکا شامل ہیں۔

مقامی اخبارات نے ہفتہ اقبال کی سرگرمیوں کو اپنے صفحات پر نمایاں جگہ دی۔ ایک اخبار نے اپنی ۱۴ مئی کی اشاعت میں ہفتۂ اقبال کے پہلے اجلاس کی روداد تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پہلا اجلاس رات نو بجے تربیت گاہ طالبات کے وسیع و عریض لان میں منعقد ہوا۔ اس لان کو بڑی عمدگی سے سجایا گیا جگہ جگہ آرائشی محرابیں تیار کی گئیں۔ شہ نشیں کو رنگ برنگی پرچموں اور اقبال کے شعروں کے کتبوں اور طغروں سے آراستہ کیا گیا۔ عورتوں کے لئے ایک علیحدہ گیلری بنائی گئی ٹھیک نو بجے نواب حسن یار جنگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تربیت گاہ طالبات میں داخل ہوئے تو ارکان استقبالیہ نے ان کا پرجوش استقبال کیا اس موقع پر سید زین العابدین نے جو مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے، خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں نواب حسن یار جنگ کی اقبال دوستی کو سراہتے ہوئے کہا

"میں نواب حسن یار جنگ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں، آپ کی ہستی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے علمی اور ادبی کارناموں سے ایک زمانہ واقف ہے۔ آپ کی سرپرستی میں حیدر آباد اور بیرونِ حیدر آباد میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں جن کے ذریعہ اقبال کی تعلیمات عام کیجاتی ہیں"۔

جب زین العابدین خطبۂ استقبالیہ ختم کر چکے تو نواب حسن یار جنگ سے درخواست کی کہ وہ اپنی صدارتی تقریر سے مستفید فرمائیں۔ نواب حسن یار جنگ نے بزم اقبال رائچور شاخ کے عہدہ داروں اور ارکان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اقبال کے کلام و پیام کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین اس وجہ سے بنایا ہے کہ اس کے ذریعہ ملک کے نوجوانوں میں سیاسی، سماجی اور مذہبی بیداری پیدا ہوگی اور وہ آج کے دور کے انقلابی تقاضوں کو پورا کر سکیں گے۔

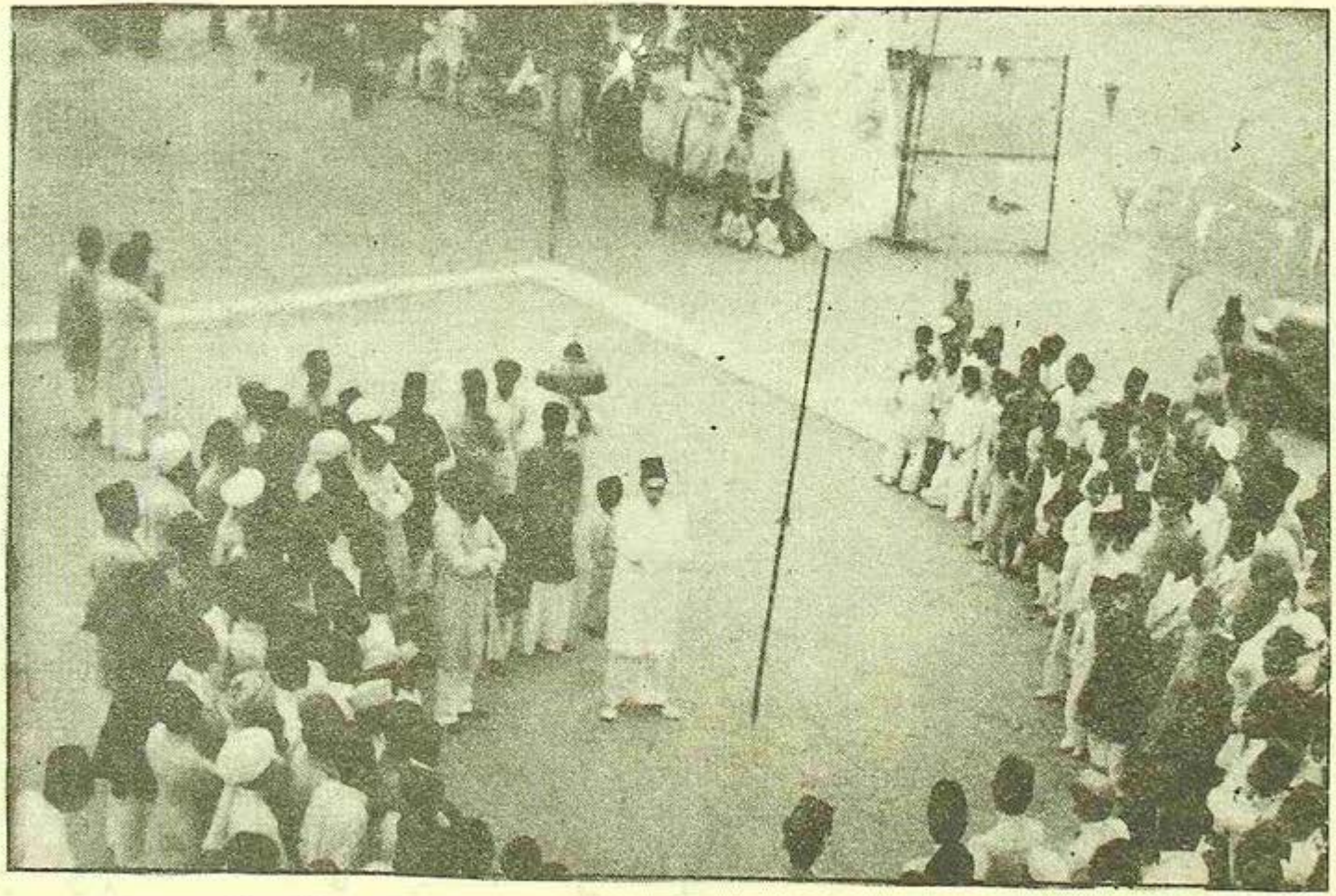

ہفتۂ اقبال کے موقع پر رائچور میں رسم پرچم کشائی کا ایک منظر، جس کا افتتاح نواب حسن یار جنگ نے کیا۔

حالیہ جنگ کے دوران ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ترکی کا مرد بیمار ایسی بے مثال، طاقت اور قوت کا حامل ہوگیا ہے کہ بڑی بڑی قومیں اس کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

حبش نے بھی اپنی جدوجہد کے نتیجے میں آزادی حاصل کر لی ہے۔ اسی طرح انڈونیشیا کے عوام بھی اپنی آزادی کے لئے سینہ سپر ہوگئے ہیں۔۔۔ ہندوستان بھی ایک عظیم الشان سیاسی انقلاب کے دوراہے پر کھڑا ہوگیا ہے۔ حیدرآباد میں بھی بڑی اہم معاشی، اقتصادی اور سماجی تبدیلیاں ہوں گی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اقبال کے افکار و تعلیمات کی روشنی میں حیدرآباد کے رہنے والوں کی اہلیت کا جائزہ لیا جائے جو دراصل ہر کامیابی اور ناکامیابی کی بنیاد بن سکتی ہے۔"

خطبۂ صدارت کے اختتام پر کرسیٔ صدارت سے ایک قرارداد پیش کی گئی جس کو تربیت گاہ طالبات کے لان میں موجود دس ہزار سے زائد افراد نے یکزباں منظور کیا۔ قرارداد یہ تھی۔

"یہ عظیم الشان جلسہ ہفتۂ اقبال جلالتہ الملک اعلیٰحضرت بندگان اعلیٰ شہریار برار و دکن کی بارگاہ معارف پرور میں اپنے غیر متزلزل عقیدت مندی کا اظہار کرتا ہے۔"

قرارداد منظور ہو چکی تو اردو کے مشہور رباعی گو شاعر احمد حسین امجد نے قلندرانہ انداز میں اسٹیج پر آکر چند رباعیاں پڑھیں۔ ان کے بعد مجلس استقبالیہ کے نائب صدر مولوی بشیر احمد صدیقی نے پیغامات سنائے جو ہفتۂ اقبال کے سلسلہ میں موصول ہوئے تھے۔

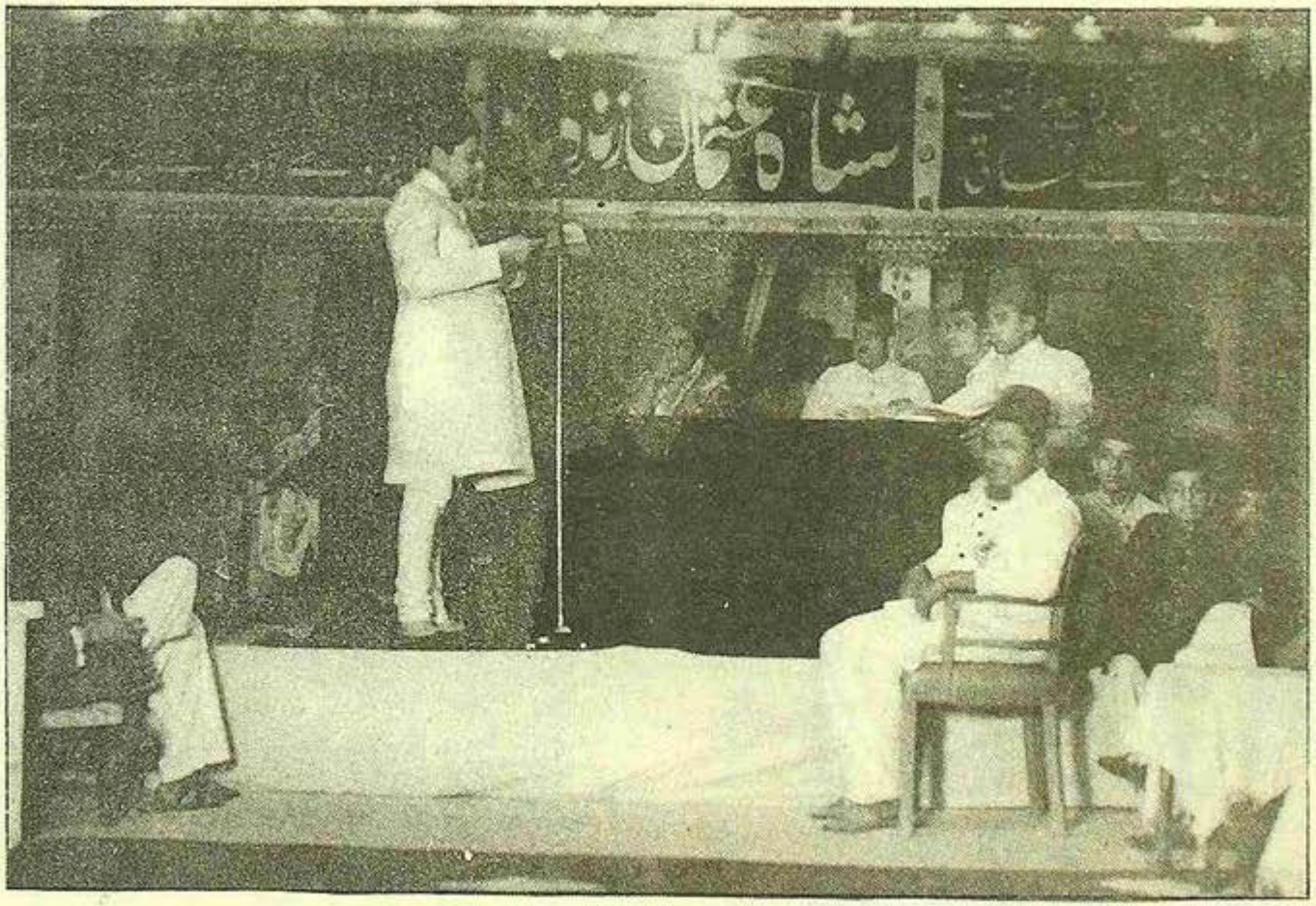

اپریل ۱۹۴۵ء میں مرکزی بزم اقبال نے رائچور میں یوم اقبال منایا اس یوم میں نواب حسن یار جنگ خطبۂ استقبالیہ پیش کر رہے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو ــــــ

"کاش آزادی اور امن کا حامل پیامِ اقبال سارے ہندوستان میں جاری وساری ہو جائے"۔

سروجنی نائیڈو ــــــ

"اقبال کے پیام کی روشن کرنیں کبھی مدھم نہیں پڑسکتیں

مہاراجہ کپورتھلہ ــــــ

"اقبال میرے پرانے دوست تھے میں ان کے کلام کو بیحد عزیز رکھتا ہوں"

نواب حمید اللہ خاں بھوپال ــــــ

"اقبال کے پجاری سے آپ پیام مانگتے ہیں جو ان کے آخری وقت تک رفیق اور ان کے کلام کا شیدا رہا"۔

نواب لیاقت علیخاں ــــــ

"بزم اقبال مبارکباد کے قابل ہے کہ وہ اپنے صدر نواب حسن یار جنگ کے زیر صدارت ہفتۂ اقبال بہ مقام رائچور منا رہی ہے۔ میں اہل رائچور کو بھی قابل مبارکباد سمجھتا ہوں کہ وہ ایسے شاعر کے کلام سے استفادہ کر رہے ہیں جو عالمگیر اور ہمہ گیر ہے"۔

خواجہ حسن نظامی ــــــ

"ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام مشرق کے لئے روشنی کا ایک مینار ہے۔ مرحوم ڈاکٹر صاحب موجودہ زمانے کے ممالک مشرقی میں سے اپنے کلام کے ذریعہ نئی زندگی کی رُوح پھونکنے والے تھے، سلطنتِ آصفیہ ہندوستانی اور ایرانی بلکہ مشرقی کلچر کا ایک مرکز ہے لہٰذا اس سلطنت کے ایک لائق وفائق

امیر نواب حسن یار جنگ بہادر کا اس تحریک کی طرف متوجہ ہونا علامت ہے اس بات کی کہ اقبال کی شاعری نے ہر مشرقی کے دل کے اندر نئی زندگی کا ایک گہرا اثر پیدا کر دیا ہے"۔

سر آرتھر لوتھیاں ریزیڈنٹ ——

"ہندوستان کے جلیل القدر اور ممتاز شاعر کی یاد منانے کے لئے آپ نے جو اقدام کیا ہے اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں"

مہاراجہ میسور ——

"آپ کو اقبال کے کلام سے استفادہ کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں

پروفیسر نکلسن کی وفات

جب پیامات کا سلسلہ ختم ہوا تو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے رموزِ بے خودی کے انگریزی مترجم پروفیسر نکلسن کے انتقال پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر نکلسن کی اقبال سے ایک طویل عرصہ تک خط و کتابت رہی ہے انہوں نے رموزِ بے خودی کو انگریزی میں منتقل کر کے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کو انگریزی داں اصحاب کسی بھی دور میں فراموش نہیں کر سکیں گے۔ قرارداد میں کہا گیا تھا:

"ہفتۂ اقبال کا یہ اجلاس انگریزی کے قادر الکلام ادیب، پروفیسر نکلسن کی وفات حسرت آیات پر اظہارِ افسوس کرتا ہے ان کی وفات سے ہم نے ایک اچھا ادیب کھو دیا جو مشرقی علوم کا عالم تھا"۔

اس قرارداد کے بعد برزو جی فیروز شاہ تارا پور والا نے علامہ اقبال کی شاعری پر اپنا مقالہ پڑھا اس کے بعد دکنی زبان کے شاعر نذیر دہقانی نے اقبال پر نظم سنائی

حسن یار جنگ کا خراج عقیدت

جشنِ اقبال کے افتتاح نے عوام میں زندگی کی نئی ہل چل پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا دوسرا ادبی اجلاس پبلک گارڈن میں شروع ہوا تو وہاں دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار سے زیادہ افراد والہانہ انداز میں جمع ہو گئے۔ جب بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ اپنی افتتاحی تقریر سے اس کا آغاز کرنے پہنچے تو ان کا اقبال زندہ باد، میر عثمان علی خاں زندہ باد اور ریاست حیدرآباد زندہ باد کے پُرجوش اور ولولہ انگیز نعروں سے استقبال کیا گیا۔ انہوں نے علامہ محمد بن عبدالوہاب المامون کی قرأت کے بعد اپنی افتتاحی تقریر میں اقبال کے کلام کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی، انہوں نے کہا۔

"یہ غلط ہے کہ اقبال کسی مخصوص طبقہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے ملّت و مذہب کی تخصیص کے بغیر ہر فرد کو انسانیت کی بلندی پر دیکھنا چاہا ہے۔ انہوں نے اسی طرح انسان کے کردار اور اخلاق کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا ہے جس طرح گیتا کے حوالوں سے انسانیت کے ارتقا کا پیام دیا جاتا ہے آج جبکہ دنیا، سیاسی آویزشوں اور مذہبی منافرتوں کا شکار ہو چکی ہیں۔ اقبال کے پیام کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے یک جہتی، اتحاد اور یگانگت کا درس دیا ہے۔"

مختلف اہلِ قلم کا اظہارِ سپاس

اس تقریر کے بعد سید اکبر وفا قانی نے اقبال اور آرٹ پر ایک مقالہ سنایا۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں کی تفصیل بیان کی۔ ڈاکٹر صاحب سے اقبال کی خط و کتابت ہی نہیں تھی بلکہ وہ اکثر مقامات پر ان کے شریکِ سفر بھی رہے تھے اس لئے لوگوں نے ان کے بیانات کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ مانک راؤ نے انگریزی میں مقالہ پڑھا۔ شاہد صدیقی نے اقبال پر نظم سنائی۔ یوم اقبال بمبئی کے داعی محمد حسین نے تعلیمات اقبال کے ماخذوں کا جائزہ پیش کیا۔ تقاریر کا یہ سلسلہ رات دو بجے تک چلتا رہا۔ لوگ پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ہر مقرر اور ہر اسکالر کو سنتے رہے تھے۔ رات کے ۲ بجے سیدہ اختر، صدارتی تقریر کے لئے کرسیٔ صدارت سے اُٹھ کر مائک پر تشریف لائیں تو پورا ایوان خطیبۂ ہند، زندہ باد اور زہرہ سخن زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ عوام ان کی انقلابی نظموں سے پوری طرح آگاہ تھے، وہ جانتے تھے کہ سیدہ اختر کی شاعری نے ملک کے نوجوانوں میں کس طرح بیداری کی لہر پیدا کی ہے۔ انہوں نے کہا:

"اقبال اور ان کے بارے میں اتنا لکھا جا چکا ہے کہ شاید ہندوستان میں یہ شرفِ بلند کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہوا ہو۔ اردو، انگریزی اور اور دیگر زبانوں میں بے شمار مقالے اور کتابیں عرصۂ وجود میں آچکی ہیں اقبال نے اسلامی تعلیمات میں جدید روح پھونکی ہے اس کا فلسفہ تدبیر انسان کی تقدیر اور اس کی کامیابی کے تمام امکانات پر حاوی ہے۔ وہ ایک ایک نقطۂ حیات کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ ہندوستان کا جذبۂ بقا دراصل نتیجہ ہے اس تصادم کا جو انگریزی اقتدار اور ہندوستان کے درمیان

گذشتہ چھ سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں بلکہ فکری اور ذہنی بھی ہے۔ اقبال کا کلام ہر گھر میں ہونا چاہیئے تاکہ ہماری نئی نسل اس کو پڑھے اور قومی مستقبل تابناک ہو۔"

اقبال کے آخری اور تیسرے اجلاس کی صدارت پرنسپل محمڈن کالج مدراس افضل العلماء مولوی عبدالحق نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

مولوی عبدالحق کی صدارتی تقریر کے بعد محمد انور خاں جامعی نے اقبال اور جمال الدین افغانی پر اپنا مقالہ پڑھا۔ پروفیسر حسن الاعظمی نے اقبال کی تعلیمات پر روشنی ڈالی۔ ظفر حسین نے بچوں کا اقبال پر تقریر کی۔ آخر میں ارکان استقبالیہ کی جانب سے سید زین العابدین نے نواب حسن یار جنگ سے درخواست کی کہ وہ خطبۂ اختتامیہ ارشاد فرمائیں۔ نواب حسن یار جنگ نے اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر تفصیل سے بحث کی جس میں اس نے بین الاقوامی رجحانات اور تقاضوں کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا۔

"آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ کوئی مہینہ ایسا نہیں جاتا کہ ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشے سے اقبال کے کلام کے کسی نہ کسی پہلو پر کسی نہ کسی زبان میں کوئی کتاب شائع نہ ہوتی ہو۔ اس وقت تک اقبال پر جتنے مضامین، مقالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کر گئی ہے اور حیدرآباد کے تمام ہی تعلیمی اداروں میں اقبال کے مطالعہ کا ذوق و شوق بڑھ رہا ہے۔ یہ امر بھی باعثِ مسرت ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے بھی ایم اے کے مقالوں کے لئے طلبہ کو اقبال ہی سے متعلق موضوعات دیئے جا رہے ہیں۔

ساتواں باب

عطیہ بیگم اور بزم اقبال

عطیہ بیگم کا نام آتے ہی ذہن میں کہانیوں کا ذخیرہ کھل جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جنہوں نے جدید رجحانات کو اپنایا اور مغربی تعلیم کے حصول کے لئے یورپ گئیں۔ یورپ کے قیام کے دوران اقبال سے ان کا تعارف ہوا اور پھر اقبال ان سے اس قدر بے تکلف ہو گئے کہ ان سے اپنی دلی پریشانیوں اور نجی معاملات میں مشورہ کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ چنانچہ جب ۱۹۱۰ء میں اقبال حیدر آباد آئے تو ان کا تعارف عطیہ بیگم نے ہی سر اکبر حیدری سے کروایا جہاں وہ معتمد فنانس تھے۔

عطیہ بیگم کا اعتراف

حیدر آباد میں عطیہ بیگم کے عزیزوں، دوستوں اور مداحوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ سب اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر فائز تھے۔ جب مرکزی بزم اقبال حیدر آباد کی دعوت پر ۱۹۴۵ء میں وہ حیدر آباد آئیں تو سینکڑوں معززین شہر نے ان کا پرتپاک

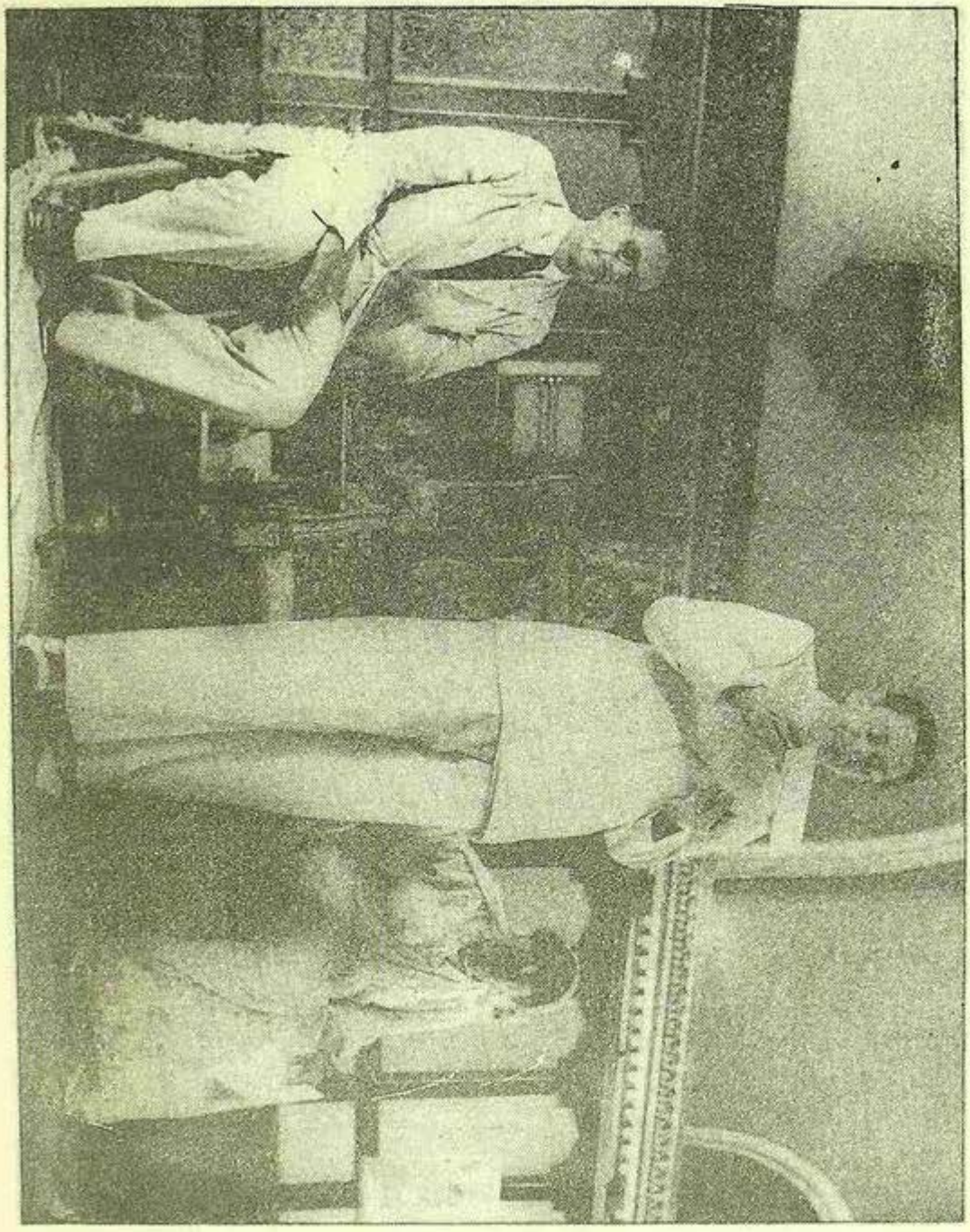

اکیڈمی آف اسلام بمبئی نے یوم اقبال منایا۔ اس موقع پر نواب حسن یار جنگ افتتاحی تقریر کر رہے ہیں۔
تصویر میں ان کے قریب ہی اکیڈمی کی سیکریٹری عطیہ بیگم بیٹھی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

استقبال کیا۔ انہوں نے اس سے پہلے بزم اقبال سے متعلق خبریں صرف اخباروں میں پڑھی تھیں لیکن جب خود اپنی آنکھوں سے اقبال شناسی کے پُرخلوص مناظر دیکھے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔

"مجھے نواب حسن یار جنگ کی قائم کردہ بزم اقبال کے ایک جلسہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں فلسفۂ اقبال کی تعلیم و تشریح ایسی صداقت اور ایسی دلچسپی کے ساتھ عمل میں لائی جاتی ہے کہ میں نے ایسے ادارے کے قیام کی منشا کی طاقت کو محسوس کر لیا اور جب میں نے دیکھا کہ کس قدر، تکلیف قربانی اور محنت کے ساتھ کام جاری رکھا جاتا ہے تو مجھ پر غیر شعوری طریقہ پر اس کی صداقت اور عزم کا اثر پڑا۔ میں نے نواب حسن یار جنگ کو اس اسلامی تعلیم کا کہ علم کا حاصل کرنا سب سے افضل چیز ہے اور اس کی تلاش کے لئے انسان کو دنیا کے دوسرے کنارے بھی جانا چاہیئے، مجسّم نمونہ پایا۔"

عطیہ بیگم پر یوم اقبال کی کامیابی اور بزم اقبال کے صدر، عہدیداروں اور کارکنوں کے اخلاص و عمل کا اس قدر اثر ہوا تھا کہ وہ بمبئی پہونچنے کے بعد بھی اسے اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکیں۔ انہوں نے اپنے بعض ہم خیال دوستوں کو بُلا کر ان سے کہا کہ وہ ۲۷ اور ۲۸ اپریل کو اکیڈمی آف اسلام کے زیر اہتمام یوم اقبال منانا چاہتی ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں تعاون کریں۔ عطیہ بیگم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اس حلقے میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی جنہوں نے ایوانِ رفعت میں کئی بار اقبال کو دیکھا اور سنا تھا۔ سب نے تعاون کا یقین دلایا تو عطیہ بیگم نے حیدرآباد کے کئی ادیبوں اور شاعروں کو دعوت نامے بھیجے اور ایک خط کے ذریعے نواب حسن یار جنگ سے اس یوم اقبال کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کے لئے

درخواست کی۔

نواب حسن یار جنگ بمبئی میں

اس سے پہلے سروجنی نائیڈو نے بمبئی کے قیام کے دوران کئی مرتبہ اقبال کی یاد میں جلسے کئے تھے لیکن یہ جلسے تاج محل ہوٹل کے ایک بڑے کمرے میں ہوئے تھے اس لئے ان میں محدود لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ عطیہ بیگم کی اکیڈمی آف اسلام کے زیر اہتمام منایا جانے والا یوم اقبال ان جلسوں سے مختلف تھا۔ چنانچہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء کی صبح کو انجمن اسلام ہائی اسکول میں اقبال کے مداح اور پرستار بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ جب نواب حسن یار جنگ اور ان کے ساتھیوں کی کار انجمن اسلام ہائی اسکول پر رکی تو عطیہ بیگم نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور مسند صدارت تک لے گئیں۔ بعد میں انہوں نے عطیہ بیگم کی درخواست پر اجلاس کا افتتاح کیا اور جلسہ کی کارروائی باقاعدہ طور پر شروع ہوئی۔ نواب صاحب کے افتتاحی خطبہ کے بعد نواب ہوش یار جنگ کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ جو انہوں نے اس موقع کے لئے حیدرآباد سے روانہ کیا تھا۔ نواب صاحب اپنی لسانی خوبصورتی اور خیالات کی پاکیزگی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ چنانچہ ان کے پیغام سے لوگوں نے بڑی دلچسپی لی۔ انہوں نے اپنے پیغام میں یوم اقبال کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کے لئے نواب حسن یار جنگ کے انتخاب پر اکیڈمی آف اسلام کے عہدیداروں کو مبارکباد دی اور اپنے مخصوص انداز میں اقبال کے حالات و سوانح پر روشنی ڈالی۔

"دور اقبال انسانیت کی آخری پیداوار کے سلسلہ میں ان چند انسانوں میں سے ہیں جنھیں دنیا صدیوں کی کاوشوں کے بعد پیدا کرتی ہے اور جن کے شانوں پر تہذیب و تمدن کی تعمیر کا گراں بوجھ رکھا جاچکا ہے

مشرقی انسانوں کے لئے اقبال کی شاعرانہ زندگی ایسا سبق ہے جس پر عمل کر کے وہ صحیح معنوں میں زندگی کا ثبوت دے سکتے ہیں اور اس مشرق کے فساد آباد کو امن آباد کر سکتے ہیں۔ اقبال کے پیغام کو سُن کر ہمارے نوجوان غیروں کے سہارے کا ننگ گوارا کرنے کے بجائے دوسروں کو اپنی تقلید پر مجبور کر سکتے ہیں"۔

اس پیغام کے بعد پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنی ایک توسیعی تقریر پڑھی اِسے اس یومِ اقبال سے بہت پہلے لکھا گیا تھا۔

"حضرات! میری معروضات کا سلسلہ سب سے بڑے زندہ شاعر اقبال تک محدود ہے، اقبال کی شہرت، ان کی لیاقت، ان کا تبحّر، ان کی سیاست دانی، ان کا فلسفہ، ان کی عام اصلاحی شاعری ایسی چیزیں ہیں جو کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ نہ صرف ہندوستان، نہ صرف عالمِ اسلام، نہ صرف عالمِ قدیم بلکہ ساری علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی دنیا ان کے خصائص سے واقف ہے"۔

اس کے بعد ندوی صاحب نے اقبال کے حالات، ماحول اور سوانحی زندگی کے بعض واقعات کا تجزیہ پیش کیا اور بتایا کہ اس تجزیہ کے بغیر شاعری کے مختلف مدارج، اثر پذیری اور پیغام کو سمجھنا مشکل ہے۔ ندوی صاحب کے بعد رئیس احمد جعفری نے اقبال کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات بیان کئے وہ اس وقت روزنامہ 'خلافت' کے مدیر تھے انہوں نے صرف ایک مرتبہ اقبال کو دیکھا تھا اور عطیہ بیگم کے ایوان رفعت کی سیر بھی کی تھی۔ انہوں نے مختلف یادوں کو اپنے ذہن میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"۱۹۳۳ء میں اقبال کسی کام سے دہلی آئے۔ جامعہ ملیہ والوں نے

طے کیا کہ ایک پارٹی دی جائے۔ میں انجمن اتحاد طلبہ کا نائب صدر تھا میرا تعارف بھی کرایا گیا۔ اقبال مطبوعات جامعہ کی نمائش کا نظارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کی نظر سیر محمد علی پر پڑی جسے میں نے تصنیف کیا تھا۔ وہ رک گئے، کتاب اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ نہایت شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ بہت سے واقعات محمد علی کے بارے میں ایسے بتا سکتا ہوں جن کا میرے سوا کسی کو علم نہیں ان سے فائدہ اٹھا لیتے۔ میں نے کہا ضرور اٹھاؤں گا۔"

رئیس احمد جعفری کے ذہن سے کئی واقعات کیمرہ کی تصویروں کی طرح نکل رہے تھے۔ جب ان کی یادداشتوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو انجمن اسلام ہائی اسکول کے سابق استاد ضیاء الدین احمد برنی نے اس گارڈن پارٹی کی روداد بیان کی جس کو ۱۹۳۲ء میں عطیہ بیگم نے اقبال کے اعزاز میں ترتیب دیا تھا۔ اس پارٹی میں شہر کے مقتدر لوگوں نے شرکت کی تھی۔ برنی صاحب کہتے ہیں۔

"گول میز کانفرنس سے لوٹتے وقت اقبال نے بمبئی میں چند دن قیام کیا تھا۔ اس موقع پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان ایوانِ رفعت میں ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا تھا جس میں روسا اور مہاراجگان کے علاوہ اسلامی ممالک کے قونصل اور مرزا علی اکبر خاں مرحوم جج ہائی کورٹ بمبئی۔ مولانا محمد عرفان مرحوم، ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی جیسے بہت سے فاضل حضرات بھی تشریف فرما تھے اس وقت جب حاضرین سے ان کا تعارف کرایا جا رہا تھا تو میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ان سے نہایت عقیدت مندانہ احترام سے مل رہے تھے حالانکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے اقبال کو صرف نام ہی سے

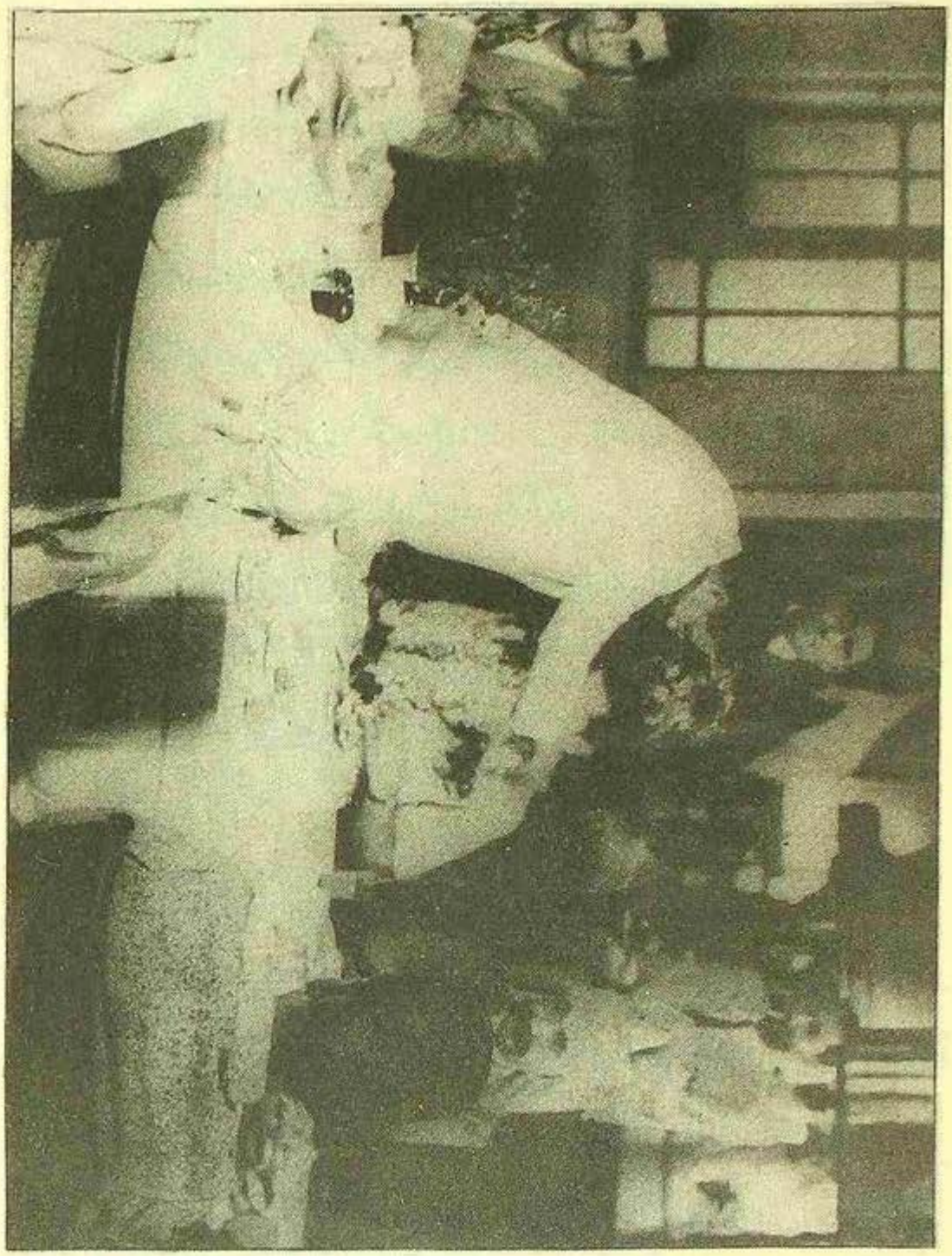

پنجاب مسلم ایسوسی ایشن بمبئی کی جانب سے تاج محل ہوٹل بمبئی میں یومِ اقبال منایا گیا۔
تصویر میں ذوالفقار علی بخاری، نواب عبدالقیوم خاں، وزیر جوناگڑھ اور
نواب حسن یار جنگ نظر آرہے ہیں جن کی گل پوشی کی گئی تھی۔

سنا تھا اور ان کے شاعرانہ کمالات سے مطلق واقف نہ تھے۔ مجمع نے علامہ اقبال سے درخواست کی کہ وہ بذریعہ تقریر اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں اور کوئی پیغام بھی عطا کریں۔ جواب میں علامہ نے انگریزی میں ایک مختصر سی تقریر کی۔"

اس جلسہ کی خبریں بمبئی، حیدر آباد اور مدراس کے کئی اخباروں میں شائع ہوئیں بعض اخباروں نے اس جلسے میں پڑھے جانے والے مضامین کے اقتباسات کو بھی جگہ دی۔ یہی نہیں بلکہ دی انڈین پی این اے کے شمارے مورخہ یکم جون ۴۶ء میں اُردو اجتماعات کی رپورٹ میں درج کیا گیا۔

"اقبال کی یاد بمبئی میں ۲۷ اور ۲۸ اپریل کو منائی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام اکیڈمی آف اسلام اور مرکزی بزم اقبال حیدر آباد دکن نے کیا تھا اس کا افتتاح نواب حسن یار جنگ بانی بزم نے کیا اور افتتاحی تقریر فرمائی۔"

عطیہ بیگم اور نواب حسن یار جنگ

عطیہ بیگم سے اقبال کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اور وہ اقبال کی دل سے قدر و منزلت کرتی تھیں۔ عطیہ بیگم کے پاس اقبال کے ان خطوط کا خاصا ذخیرہ تھا جو اقبال نے ان کو وقتاً فوقتاً تحریر کئے تھے۔ اس کے علاوہ اقبال کے ذکر سے عطیہ بیگم کی وہ ڈائری بھی بھری ہوئی تھی جو انہوں نے اپنے قیام لندن کے زمانے میں مرتب کی تھی۔ ان خطوط اور اس ڈائری سے اقبال سے متعلق بہت سے نئے پہلو سامنے آسکتے تھے۔ اس لئے اقبال کی وفات کے بعد جب مختلف لوگوں نے افکارِ اقبال کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا تو عطیہ بیگم سے بھی اس بات کی خواہش کی کہ وہ اقبال سے متعلق اپنی ڈائری کے اوراق اور خطوط شائع کر دیں۔ عطیہ بیگم خیال کرتی تھیں کہ اس خواہش کے پیچھے محض ذاتی مفاد کارفرما ہے اس لئے انہوں نے اس

10 AURANGZEB ROAD
NEW DELHI

21st April, 1947.

Dear Sir,

I have received the book entitled "Iqbal" by Atiya Begum, which you sent me and I thank you for it. I shall certainly read it with interest.

Yours faithfully,

M. A. Jinnah

Nawab Hasan Yar Jung,
Academy of Islam,
Hyderabad (Deccan).

عطیہ بیگم کی کتاب اقبال سے متعلق قائداعظم محمد علی جناح کے اس خط کا عکس
جو نواب حسن یار جنگ کے نام لکھا گیا تھا۔

کو قابل اعتنا نہیں سمجھا لیکن جب ۱۹۴۶ء میں وہ یوم اقبال کے سلسلے میں حیدرآباد پہنچیں اور مرکزی بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ سے ملیں تو انہیں یہ جان کر بڑا اطمینان ہوا کہ اسلامیانِ ہند میں صرف نواب حسن یار جنگ کی شخصیت ہی ایسی شخصیت ہے جو پورے اخلاص، محنت اور تندہی کے ساتھ افکارِ اقبال کو ہر ممکن اور موثر طریقے سے عام کر رہی ہے اور حیدرآباد کا ہر مسلمان خود کو اقبال کا مردِ مومن یا مردِ قلندر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ جب نواب حسن یار جنگ نے عطیہ بیگم سے کہا کہ وہ اقبال سے متعلق اپنی ڈائری کے اوراق اور خطوط شائع کر دیں تو وہ بخوشی راضی ہو گئیں۔ یہ کتاب اقبال کے عنوان سے سب سے پہلے ۱۹۴۶ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ عطیہ بیگم نے اس کا انتساب نواب حسن یار جنگ کے نام کیا اور ساتھ ہی ان کی تصویر بھی شاملِ اشاعت کی جس میں وہ حیدرآباد کے شاہی لباس میں نظر آ رہے تھے۔ اس کتاب کے ابتدائیہ میں عطیہ بیگم نے حسن یار جنگ کی مساعی کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ اپنے ابتدائیہ میں لکھتی ہیں۔

"یہ عجیب بات خیال کی جائے گی کہ میں نے اقبال کے خطوط کو اور یورپ میں ان کی تعلیمی زندگی کے بارے میں اپنے تاثرات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا حالانکہ اتنے برس تک ایسی کتاب کا مواد میرے پاس اسطرح پڑا رہا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس وقت بھی میں یہ تمام معلومات اپنی مرضی سے پبلک کے سامنے پیش نہیں کر رہی ہوں۔ اس لئے کہ اس قسم کا خیال میرے دل و دماغ میں کبھی بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ میں اس مجموعہ کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اس کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو لیکن میں پبلسٹی پر کسی قسم کا یقین نہ رکھتے ہوئے ایسے اقدام میں جھجک محسوس کر رہی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ سارا مواد اب تک عام نظروں سے پوشیدہ رہا۔ چند ایک کو اتنا علم ضرور تھا کہ میرے پاس اقبال کی بعض اصل نظمیں موجود ہیں اور ان کی اشاعت کے لئے بھی درخواستیں پہونچی تھیں لیکن میں نے ایسی درخواستوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اس لئے کہ بعض تو شوقِ دیدار پورا کرنے کے لئے کی گئی تھیں اور بعض محض ذاتی منفعت

پر مبنی تھیں، یہاں تک کہ ریاست حیدرآباد کے حالیہ سفر میں میری ملاقات امیر پائیگاہ جناب نواب حسن یار جنگ بہادر سے ہوئی۔

مجھے نواب حسن یار جنگ بہادر کی قائم کردہ اقبال سوسائٹی (بزم اقبال) کے ایک جلسے میں مدعو کیا گیا تھا جہاں فلسفۂ اقبال کی تعلیم اور تشریح ایسی صداقت اور ایسی سچی دلچسپی کے ساتھ عمل میں لائی جاتی ہے کہ میں نے ایسے ادارے کے قیام کے منشا کی طاقت کو محسوس کر لیا اور جب میں نے دیکھا کہ کس قدر تکلیف، قربانی اور محنت کے ساتھ کام جاری رکھا جاتا ہے تو مجھ پر غیر شعوری طور پر اس کی صداقت اور عزم کا اثر پڑا۔ میں نے نواب حسن یار جنگ بہادر کو اسلامی تعلیمات کا (کہ علم حاصل کرنا سب سے افضل چیز ہے اور اس کی تلاش کے لئے انسان کو دنیا کے دوسرے کنارے چین بھی جانا چاہیئے) مجسم نمونہ پایا، نہ صرف یہ کہ وہ خود علم حاصل کرنے کی جستجو میں لگے رہے ہیں بلکہ اپنے ارادے کے ذریعہ وہ اس مطمع نظر تک پہونچنے کے لئے ہر ایک کی امداد بھی کرتے رہتے ہیں اور یہی وہ بہترین عمل ہے جسے ایک سچا مسلمان انجام دے سکتا ہے نواب حسن یار جنگ بہادر ہی نے اس خیال کا اظہار کیا تھا اور میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ میں اس خیال کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے پبلک کے روبرو اس مجموعہ کو پیش کروں"۔

اقبال اور قائد اعظم

عطیہ بیگم نے اس مجموعہ یعنی اپنی مرتب کردہ کتاب "اقبال" کی اشاعت کے بعد اس کی چند کاپیاں بطور سپاس نواب حسن یار جنگ بہادر کو بھجوائیں۔ اس سے کچھ پہلے قائد اعظم محمد علی جناح نے بزم اقبال کے دفتر کا معائنہ کیا تھا اور اس کی جانب سے اقبال کے پیام و کلام کے سلسلے میں کیجانیوالی کوششوں کی تعریف کی تھی۔ قائد اعظم کی اسی دلچسپی کے پیش نظر نواب حسن یار جنگ نے عطیہ بیگم کی اس کتاب کا ایک نسخہ قائد اعظم کی خدمت میں ارسال کیا۔ قائد اعظم ان دنوں سیاسی طور پر بے حد مصروف تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ مسلمانان ہند کی جدوجہد آزادی اور حصول پاکستان کے سلسلہ میں پیش آنے والے مسائل کے سوا کسی اور جانب متوجہ ہو سکیں۔ اس کے باوجود انہوں نے عطیہ بیگم کی کتاب موصول ہونے پر نواب حسن یار جنگ کو شکریہ کا خط لکھا۔

آٹھواں باب

حیدر آباد ظلم کے نرغے میں

۱۹۴۸ء کا زمانہ حیدر آباد اور اہل حیدر آباد کے لئے بہت پُر آشوب تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۷ء میں نظام نے انگریزوں سے ایسا معاہدہ کرنے کی بہت کوشش کی جس سے ریاست حیدر آباد اور اس کے رہنے والوں کے مفادات کا تحفظ ہو سکے لیکن انگریزوں نے نہ صرف نظام کو جن کی وفاداری کا رنگ بھرتے بھرتے ان کا گلا خشک ہو گیا تھا، دھوکہ دیا بلکہ آزادی کے بعد کے سارے معاملات نام نہاد اہنا کے ہوسکار پجاریوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے جس کے نتیجہ میں ریاست حیدر آباد، تاریخ کے ایک خونچکاں موڑ پر آ گئی۔ ۱۵ر اگست کو ہندوستان نے آزاد ہوتے ہی قتل و خون کا بازار گرم کر دیا۔ کئی شہر اور قصبے گوڈسے کے ہاتھوں قتل کئے جانے والے نیک دل مہاتما کی ارتھی کی طرح جلا دیئے گئے۔ حالات نے ایک اور بھیانک رُخ اختیار کیا۔ مسلمانوں کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اپنے وطن کی عزّت و ناموس پر کٹ مریں۔ ہندوستان کی طرف سے ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ ان کے لئے سیاسی اور معاشی موت تھی۔ انہوں نے اس مطالبے کے آگے سپر انداز ہونے کی بجائے اقبال کے فلسفۂ موت وحیات کو حرزِ جاں بنایا اور اس کے سوزِ خودی سے اپنے احساس کی مشعلیں روشن کیں۔ جواہر لال نہرو ہوں یا سردار پٹیل، سب ریاست حیدر آباد کی معاشی ناکہ بندی کر کے مسلمانوں سے ان کی وسیع المشربی کا انتقام لینا چاہتے تھے۔

یومِ اقبال کا اعلان

ان جانگسل اور کربناک حالات میں بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ نے ہفتۂ اقبال کا اعلان کر کے قوم کو شمشیر و سناں اول کا رجز دیا۔

جب سید قاسم رضوی ہفتۂ اقبال کے افتتاح کے لئے تشریف لائے تو ہزاروں نوجوانوں نے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے افتتاحی تقریر نہیں کی، انگارے برسائے۔ انہوں نے نواب حسن یار جنگ کو جو اس اجلاس کے صدر بھی تھے۔ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اقبال اور اس کا فلسفہ ایک دریا ہے، دریائے بے پایاں ہے۔ اگر میں آج اس بات کی کوشش کروں کہ اس کے ایک شعر کی تشریح کی جائے کی جائے تو پوری رات کافی نہ ہو۔ میں اقبال کے فلسفہ، اقبال کے پیام اور اقبال کے درس کو آپ کے سامنے پیش نہیں کروں گا، اس کے لئے ایک عمر درکار ہے، نہ آپ کے پاس اتنا وقت ہے اور نہ میرے پاس اور نہ مجھ میں اتنی سکت ہے کہ اس ایک اجلاس میں یہ تمام چیزیں سمجھا سکوں۔

علماء مجھے معاف فرمائیں۔ انہوں نے اسلام کی صحیح خدمت انجام نہیں دی۔ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ ہر شخص کو قرآن سمجھنے کا موقع دیتے۔ نہ صرف دس کروڑ مسلمانوں کا بلکہ ہر مسلمان کا فرض تھا۔ لیکن اس فرض کو صرف ایک شخص، اقبال نے پورا کیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مولانا روم کی مثنوی "ہست قرآن در زبان پہلوی" اور میں کہوں گا کلام اقبال قرآن کا اردو ترجمہ اور تشریح ہے۔ جو خدمت علماء کو انجام دینا چاہیئے تھی اور جن کا یہ فرض تھا۔ اس کو ایک برہمن زادے نے خوبصورت انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لوگ کہتے ہیں اقبال کا

پیام عالمگیر پیام ہے، وہ ایک عالمی شاعر ہے، کیوں نہ ہو جب قرآن خود عالمی پیام ہے تو اس کی تشریح کرنے والا کیوں نہ عالمی شاعر ہو اور کیوں نہ اس کا پیام عالمگیر پیام ہو۔"

مشاہیر کے پیغامات

اس دور میں جب کہ بھارت کی ملک ستانی کی عفریت حیدرآباد کی سرحدوں پر پوری خوں آشامی کے ساتھ منڈلا رہا تھا۔ مسلمان زیان و سود کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ سید قاسم رضوی کی تقریر بڑے جوش اور ولولہ کے ساتھ سنی گئی لوگوں نے فرقہ پرستی کی بیڑیوں کو کاٹنے اور مردانِ حق کی طرح زندہ رہنے کا نیا حوصلہ پایا۔ جب وہ اپنی افتتاحی تقریر ختم کر چکے تو بزم اقبال کے معتمد معین الدین کولاس نے پاک و ہند کے مشاہیر کے وہ پیغامات پڑھے جو اس موقع کے لئے موصول ہوئے تھے۔

قائد اعظم محمد علی جناح ـــــــ

میں یوم اقبال کی کامیابی پر حیدرآباد کو مبارکباد دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ ملک کے نوجوان علامہ اقبال کے پیام سے درس بصیرت حاصل کریں۔

پنڈت جواہر لال نہرو ـــــــ

"میں ہفتۂ اقبال کی کامیابی کا متمنی ہوں۔ شریمتی سروجنی نائیڈو بھی آپ کے ہفتۂ اقبال کی کامیابی کی متمنی ہیں اور آپ کے صدر نواب حسن یار جنگ کو سلام کہتی ہیں۔"

نواب لیاقت علیخاں

"علامہ اقبال نے جو شمع جلائی تھی اور جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو گیا

تھا لیکن اب ہندوستان میں پاکستان کے سب لوگوں کا کام ہے کہ اس کو اتحاد کی مشعل سے کامیاب بنائیں۔ اس لئے میں حیدر آباد کو قابل مبارکباد سمجھتا ہوں کہ اس نے اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے میں بڑا حصہ لیا اس لئے میں تمام حیدر آبادیوں کو قابل فخر سمجھتا ہوں۔"

خواجہ حسن نظامی ——

"ہفتۂ اقبال منا کر حیدر آباد کی آرزوؤں کو مستحکم بنانا مبارک ہو۔"

سر سپرو ——

میں بسترِ علالت سے یہ پیام دے سکتا ہوں کہ علامہ اقبال کے اتحادی خیالات کو عام کرو اور بڑھتے جاؤ۔"

غلام محمد ——

"میں ہفتۂ اقبال کے کامیاب انعقاد اور ایک کامیاب اجتماع پر آخری جلسہ کے لئے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں۔ آپ نے مرکزی بزم اقبال حیدر آباد اور اکیڈمی کے الحاق سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس مسئلہ کو میں پاکستان دستور ساز مجلس کی مقرر کردہ کمیٹی کے سامنے پیش کروں گا۔ انشاء اللہ آپ کے اور ہمارے تعلقات اور زیادہ گہرے اور حقیقی طور پر استوار ہوں گے۔ میں مرکزی بزم اقبال کا خادم ہوں اور اس کو اعلیٰ وارفع دیکھنا چاہتا ہوں۔"

عطیہ بیگم ——

"میں ہفتۂ اقبال کو ملک کی ترقی اور بقا کا ضامن سمجھتی ہوں۔ مجھے جو علامہ سے تعلق خاطر ہے۔ وہ میری کتاب اقبال سے ظاہر ہے،

حیدرآباد کی مشہور و معروف شاہراہ پر واقع مرکزی بزم اقبال کے دفتر میں بزم کے معتمد عبدالواحد کو الوداعی ضیافت دی گئی جو حیدرآباد سے پاکستان جارہے تھے

تصویر میں بزم کے عہدیداروں اور کارکنوں کے علاوہ نواب حسن یار جنگ اور ان کے ساتھ ہی عبدالواحد بھی موجود ہیں۔

جس میں میں نے ان کے تمام خطوط شائع کر دیئے ہیں میں بزم اقبال کو یہ توجہ دلاؤں گی"

اس افتتاحی اجلاس نے لوگوں کے ذوق و شوق کی صورت ہی بدل دی۔ وہ زندگی کے ایک نئے جذبے سے سرشار تھے۔ ان پر گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان" کا صحیح اطلاق ہوتا تھا۔ ان کے جوش و خروش کا اندازہ اس اخباری رپورٹ سے بھی ہوتا ہے جس کے مطابق افتتاحی اجلاس کے بعد کے اجلاسوں میں مجموعی طور پر دو لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی اور دکن میں اسلامی تہذیب کے آخری مظہر نظام سابع سے پیمانِ وفا باندھا جس کی تعریف میں اقبال نے قصیدہ لکھا تھا۔ ان اجلاسوں میں ملک کے نامور ادیبوں اور نقادوں نے مقالے پڑھے اور شاعروں نے نظمیں سنائیں۔

فلسفۂ حیات و موت

نواب حسن یار جنگ نے اس افتتاحی اجلاس کی صدارتی تقریر میں اقبال کے فلسفۂ حیات و موت پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا۔

"اقبال کے فلسفۂ حیات و موت پر غور کرنے اور عمل کرنے کا وقت آگیا ہے یا نہیں؟ میں عرض کروں گا کہ ہمارے لئے اس سے بہتر آزمائش کا وقت نہیں ہو سکتا۔ خدائے بزرگ و برتر آج دکن میں ہماری آزمائش کرنا چاہتا ہے اور ہم آزمائش کی سخت ترین گھڑیوں سے گذر رہے ہیں مجھے خوشی ہے کہ آج ریاست حیدرآباد کا یہ مسلمان اپنی آرزوؤں اور حرمت و عزت کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اقبال کا فلسفۂ حیات و موت ہی اس جدوجہد میں ہماری رہبری کرے گا۔ ہمیں ہتھیاروں کی ضرورت نہیں۔ خدا ہمیں ہمت اور یقین عطا فرمائے۔"

چغتائی کا مقالہ

دوسرے اجلاس میں خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی نے اقبال اور آرٹ پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا:

"جب میں دیوان غالب کا مصور ایڈیشن شائع کر رہا تھا تو اس کے متعلق منہ کم اور باتیں زیادہ تھیں۔ اس کی تقریظ میں میں نے لکھ دیا تھا کہ میں زبورِ عجم کا ایک ایسا غیر فانی ایڈیشن شائع کرنے والا ہوں جس کے سامنے یہ مرقع ماند ہو کر رہ جائے گا مگر جاوید نامہ کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے خود فرما دیا تھا کہ یہ کتاب ایسی کتاب ہے جسے میں نے تمہارے لئے ہی لکھا ہے تاکہ تم اسے تصویر وار کر سکو اور دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دو۔ انہوں نے اپنی وفات سے دو دن پہلے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ جاوید نامہ کا کوئی کیا ترجمہ کرے گا، مجھے آرام ہو لینے دو میں خود اس کا ترجمہ انگریزی میں کروں گا، ایک طرف نظم اور دوسری طرف اس کا مفصل نوٹ اور تصویر ہو گی۔ میں بہ عقیدت تمام ان سے عرض کیا تھا۔ میں بھی اس کا ایک ایسا ایڈیشن آپ کی مدد سے تیار کروں گا کہ دانتے کو بھی نصیب نہ ہوا ہو۔

یوسف حسین خاں کی صدارت

تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں لوگوں کی توجہ اقبال کے پیام اور اس کی اہمیت کی طرف دلائی۔ انہوں نے کہا۔

"اقبال نے اپنے کلام میں زندگی کے بارے میں اہم مسائل کا حل

پیش کیا ہے۔ اگر وہ یہی بات واعظانہ طور پر کہتے تو ان کا اتنا اثر نہ ہوتا اقبال انسانیت کا شاعر تھا۔ اس نے اپنی شاعری میں انسانی فضیلت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زندگی کے امکانات لامتناہی ہیں اور ان امکانات کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ عشق ہے جس کی وجہ سے ایک صالح تمدن قائم ہو سکتا ہے اور بغیر اس کے جو تمدن قائم ہوگا وہ اپنے اندر اپنی تباہی کا سامان رکھے گا۔ مغربی تمدن کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ذہن کی تربیت کے ساتھ دل کی تربیت کی کوشش نہیں کیگئی جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اقبال کے کلام و پیام کی اہمیت دنیا پر واضح ہوتی جائے گی۔"

چوتھے اجلاس کی صدارت صدر المہام تعلیمات بی ایس وینکٹ راؤ نے کی انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں حیدر آباد کو اقبال کی آرزوؤں کی جنت قرار دیتے ہوئے کہا

"کسی نے اقبال سے سوال کیا تھا۔ آپ کا پیام کیا ہے، انہوں نے جواب میں فرمایا تھا، میرا پیام انسانیت کی خدمت ہے۔ انہوں نے اسی کا درس دیا۔ یہ امن اور مساوات جو آپ کو ریاست حیدر آباد میں نظر آرہی ہے اس بات کی علامت ہے کہ حیدر آباد آزاد ہے، آزاد رہے گا، دنیا کی کوئی قوت ہم سے ہماری آزادی نہیں چھین سکتی آج ہندوستان صرف ہندوؤں کی نمائندگی کر رہا ہے۔ یہ فخر صرف حیدر آباد کو حاصل ہے کہ اس میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں کی بھی نمائندگی ہو رہی ہے۔ ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرنیوالے صرف گنتی کے ہیں، نہ تین میں ہیں نہ تیرہ میں حیدر آباد اچھے اور سچے لوگوں کا ہے۔ اقبال بھی اچھے اور سچے تھے۔ اسی لئے حیدر آباد من حیثیت قوم

ان کا ہفتہ منا رہا ہے"۔

جن دِنوں یہ یومِ اقبال منایا جا رہا تھا لوگوں کے دل و دماغ میں حمیت و غیرت کی چنگاریاں جاگ رہی تھیں اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اقبال کے کلام کی قوت سے بھارت کی سازشوں کو ناکام بنا دیں گے۔ بھارت خود بھی یہ جانتا تھا کہ عام حالات میں حیدرآباد پر قابو پانا یا اس کی تسخیر کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ چنانچہ وہ اپنے لئے سازگار مواقع کا انتظار کرنے لگا چنانچہ جب بابائے قوم قائداعظم کا انتقال ہوا، بھارت کی ہوسِ ملک ستانی، چیخنے اور چنگھاڑنے لگی اور اس نے بابائے قوم قائداعظم کے انتقال کی خبر سنتے ہی حیدرآباد کی جانب فوجی پیش قدمی شروع کر دی۔ حیدرآباد قائداعظم کے سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر گھر سے گریہ و فریاد سنائی دے رہی تھی۔ ایسے حالات میں، جبکہ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، حیدرآباد پر بھارت کا قبضہ ہو گیا۔ مختلف شہروں، قصبوں اور دیہات میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ سینکڑوں انسانوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ بربریت کی انتہائی گھناؤنی کہانی دہرائی گئی۔ حیدرآباد صفحۂ تاریخ سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو گیا ـــــ اور پھر اس کے حصے بخرے ہو گئے اور اب حیدرآباد ـــــ محض ایک یاد ہے ـــــ دلچسپ، رنگین اور عبرت افزا ـــــ بالکل قرطبہ کیطرح

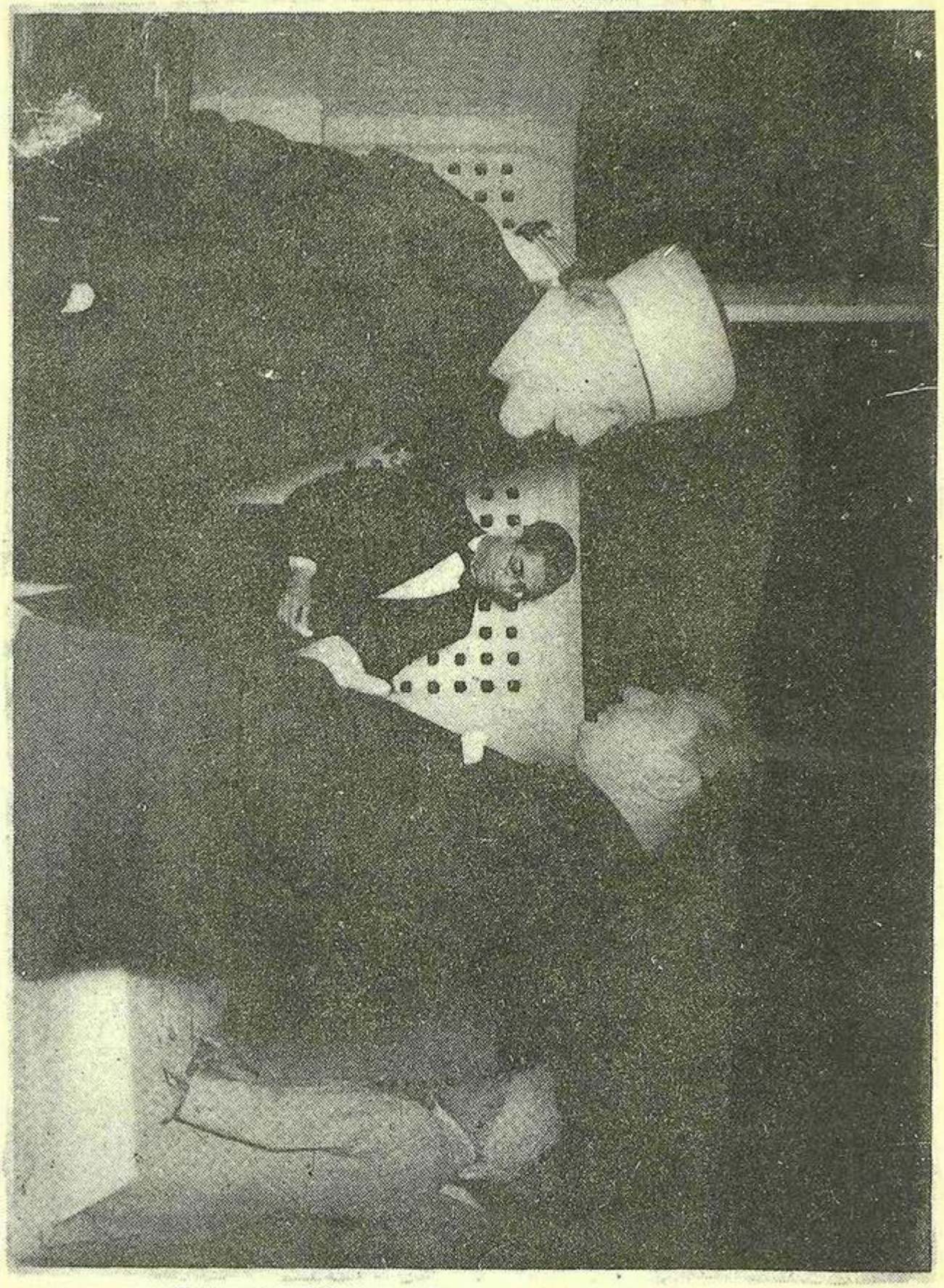

مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی مرحوم اور نواب حسن یار جنگ، ایک یادگار تصویر۔

نواب حسن یار جنگ کے نام مفتی اعظم فلسطین کے ایک خط کا عکس

الهيئة العربية العليا
لفلسطين
القاهرة

١٢ شعبان ١٣٦٧ (٢٠ يونيه ١٩٤٨)

بسم الله الرحمن الرحيم

حضرة صاحب السمو الأمير الجليل حسن يار جنگ بهادر امير پاكستان رئيس جمعية اقبال المركزية المبجل حفظه الله
حيدر آباد الدكن — الهند

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته . وأسأله تعالى ان تكونوا متمتعين بموفور الصحة والعافية . ثم انني تسلمت حديثا الكتاب النفيس ، وهو كتاب (الحياة والموت في فلسفة اقبال) هذا المؤلف النفيس الذي كان لسموكم الاجر الفضل في نشره في آفاق العالمين الاسلامي والعربي والذي يشتمل على اروع ما كتبه فيلسوف الاسلام العظيم وشاعره الكبير الصديق العزيز المغفور له السير محمد اقبال رحمه الله رحمة واسعة .

ولقد زاد من اهمية هذه الهدية في نظري انني عرفت الفقيد العظيم محمد اقبال معرفة وثيقة عندما انعقد المؤتمر الاسلامي العام في بيت المقدس سنة ١٣٥٠ هـ ، ولقيت فيه المسلم المؤمن والفيلسوف المفكر ، والعالم المدقق ، وكان رحمه الله من ابرز اعضاء المؤتمر ، وقدم له خدمات جلى بآرائه الصائبة وملاحظاته القيمة ، وقد وقع اختيار المؤتمرين عليه ليكون نائبا للرئيس وعضوا في المكتب الدائم للمؤتمر ، وكان على صلة تامة بنا حتى اختاره الله الى جواره الكريم .

ان قيام سموكم بنشر هذا المؤلف القيم لهو خدمة جلى للثقافة الاسلامية التي كان المرحوم محمد اقبال من كبار قادتها ، وما احوج العالم كله ، في هذا الدور العصيب الذي يجتازه — الى تفهم فلسفة اقبال ، والاطلاع على زبدة رسائله ومقالاته ، ليعرف قيمة الفلسفة الاسلامية وحقيقة الرسالة المحمدية التي كان رحمه الله من اكبر ناشريها .

واني اذ اقدم لسموكم اخلص الشكر على هذه الهدية القيمة التي اتقبلها منكم بعظيم التقدير ، أسأل الله تعالى ان يبارك فيكم ويجزيكم على هذه الخدمة الجليلة النافعة للاسلام خير ما يجزي عباده العاملين ، وان يحفظكم ويطيل بقاءكم

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

مفتي فلسطين
ورئيس الهيئة العربية العليا لفلسطين

نواب حسن یار جنگ کے نام مفتی اعظم فلسطین کے خط کا ترجمہ

۱۲ شعبان ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۰ جون ۱۹۴۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت عالیجناب امیر جلیل حسن یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ۔ صدر اقبال اکیڈمی مرکزی حفظ اللہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ خدائے تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔

جناب عالی کا قیمتی تحفہ "الحیات والموت فی فلسفۂ اقبال" (فلسفۂ موت وحیات اقبال کی نظر میں) وصول ہوا۔ یہ نفیس کتاب جو آپ نے عالم اسلام اور عالم عرب میں اشاعت کے لئے شائع فرمائی ہے۔ اس سے آپ نے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور جو اسلام کے عظیم فلسفی اور شاعر اور میرے دوست علامہ اقبال مرحوم ومغفور کے تالیف کردہ بہترین مضامین پر مشتمل ہے۔ میری نظر میں یہ امر ہی اس تحفہ کی اہمیت کو اس وجہ سے بھی دوبالا کر دیتا ہے کہ میری ملاقات مرحوم سے موتمر عالم اسلامی کے جلسہ منعقدہ ۱۳۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ اقبال ایک مرد مومن، بہترین مفکر اور محقق عالم تھے۔ آپ موتمر کے مشہور ارکان میں سے بھی تھے اور آپ کے افکار کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے موتمر نے بڑی خدمات آپ کے سپرد کی تھیں

اور باتفاق آراء آپ کو موتمر کا نائب صدر اور تاحیات موتمر کا رکن منتخب کیا تھا۔

جناب کا اس کتاب کو شائع کرنا ثقافتِ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اقبال مرحوم اُن عظیم فلاسفر میں سے تھے جن کے فلسفہ اور خیالات اور مسائل وافکار کی تمام دنیا اس دورِ انحطاط میں محتاج ہے تاکہ فلسفۂ اسلامی اور رسالتِ محمدیہ کی قدر و قیمت معلوم ہو جائے جس کا اقبال داعی اور ناشر تھا۔ میں جناب کی خدمت میں اس تحفہ کو قبول کرتے ہوئے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں خدائے تعالیٰ آپ کو اپنی برکات سے نوازے اور آپ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے اور اس عظیم خدمت پر آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

فقط

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دستخط مفتی فلسطین ورئیس اللجنۃ العلیا فلسطین

دستخط محمد امین الحسینی

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے

درندوں کا شکار

تصنیف

نواب حسن یار جنگ

(زیر طبع)